عمر رفتہ

104

صاحبزادہ
مقصود الرسول

Marfat.com

Marfat.com

عُمرِ رفتہ

صاحبزادہ محمد مقصودُ الرّسُول

ناشر

دارُالعلوم مقبولیہ للّٰہ شریف ضلع جہلم

Marfat.com

جملہ حقوق بحقِ مصنّف محفوظ ہیں

نام کتاب : عمرِ رفتہ

مصنّف : صاحبزادہ مقصودُ الرّسُول

باا ہتمام : محمد مسعود چوہدری

کتابت : محمد انور چوہدری

قیمت : -/۱۰۰ روپے

مطبع :

ایڈیشن : پہلا

تعداد : ایک ہزار

ناشر : دارالعلوم مقبولیہ للہ شریف ضلع جہلم

Marfat.com

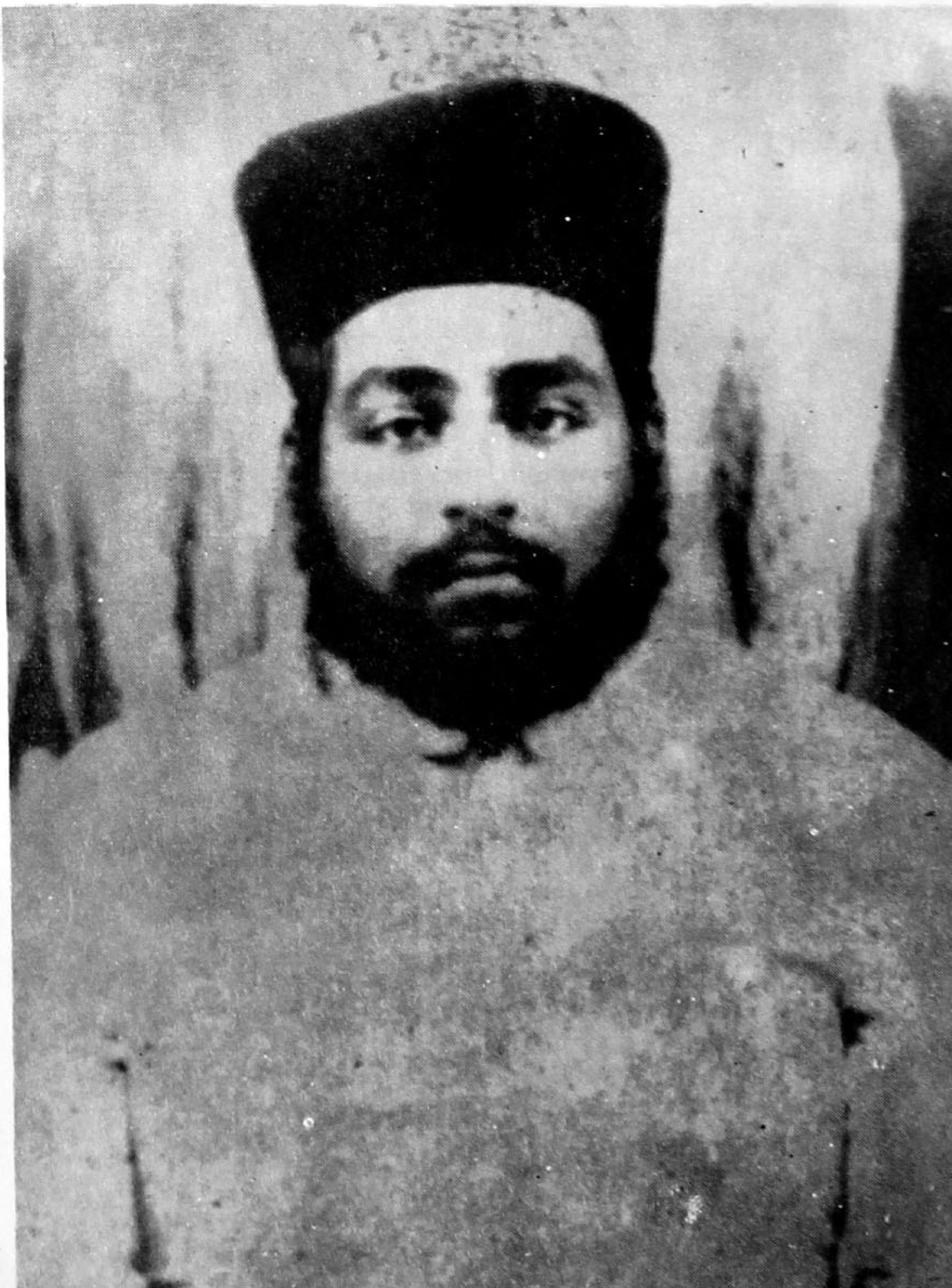

رابع حضرت صاحبزادہ محمدؐ مقبول الرّسولؐ رحمتہ اللہ علیہ

Marfat.com

Marfat.com

اِنتساب

اپنے بزرگ

اور محترم والدین

اور اپنے اعزّا و اقارب

کے نام

Marfat.com

Marfat.com

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱-	نمودِ صبح	۱۹
۲-	انقلابِ مسکن اور مکتب سے تعارف	۲۵
۳-	اینگلو ورنیکولر مڈل سکول للّٰہ	۳۳
۴-	نہ شکستہ ام سبُو را	۳۹
۵-	رتّہ شریف	۴۴
۶-	درسِ نظامی	۵۲
۷-	شیش محل	۶۴
۸-	لُطفِ دُعائے سحر	۶۷
۹-	ایامِ تحریکِ آزادی	۷۴
۱۰-	ورنیکولر فائنل کا امتحان	۸۶
۱۱-	گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب ـــ سردھی	۹۴
۱۲-	اعلیٰ حضرت الٰہی قدس سرّہٗ العزیز	۱۰۴
۱۳-	اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی	۱۱۲
۱۴-	دگر دانائے راز آید کہ ناید	۱۱۹

Marfat.com

Marfat.com

پیش لفظ

یادِ ماضی عذاب ہے یا تسکینِ قلب اور ذہنی آسودگی کا ایک ذریعہ، یہ فیصلہ میں نہیں کر سکا۔ بعض مقتدر ہستیوں نے البتہ اس کا ذکر بڑی حسرت آفریں اور یاس انگیز صورت میں کیا ہے۔ حضرت علاّمہ نے فرمایا ؎

کچھ بتا اُس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلّف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصوّر پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

بلکہ یہاں تک کہہ گئے کہ: ع

میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

ماضی سے لگاؤ ایک نکتۂ نگاہ کے مطابق تضیعِ اوقات کا دوسرا نام بھی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ع "ماضی و مستقبل اِک نقشِ خیالِ خام ہے"۔ یہ شاید اس لئے کہ ؎

Marfat.com

اگر ماضی منوّر تھا کبھی تو ہم نہ تھے حاضر
جو مستقبل کبھی ہوگا درخشاں ہم نہیں ہونگے

چنانچہ دُنیائے تخیّل میں جہاں آباد کئے رکھنے کی سعیاں، کسی صاحبِ ہوش انسان کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ماضی کا حُسن اپنے اندر ایسی کشش اور ایسا جادو رکھتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے ہی انسان اس کے سحر سے مسحور چلا آرہا ہے۔ جواں مرگ اختر شیرانی نے کہا تھا ؎

کوئی صورت تو ہو دُنیائے فانی میں بہلنے کی
ٹھہر جا اے جوانی ماتم عمرِ رواں کر لوں

اور جناب مومن خان مومن سے زیادہ پُر تاثیر انداز تو شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہو ؎

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ زمانہ تھا جو گزر گیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ماضی سے دل بہلانے کا شغل، تو ایک عام سی بات ہے لیکن ایک روز بیٹھے بیٹھے چند واقعات کی یاد ایسے آئی کہ آتی ہی چلی گئی۔ اس میں بعض ایسی پیاری اور پُر کیف ہستیاں بھی تھیں جن کا عہد ان کے بغیر بے رس اور بے کیف تھا۔ لیکن بھلا ہو "کاروانِ ہستی" کی اس "تیز گامی" کا کہ وہ آج مکمل طور پر نسیاً منسیا ہو چکیں۔ زمانہ کی اس "رواروی" پر مجھے زبردست وحشت ہوئی اور اس خوف سے کہ "مانیز روزنے ہم چنیں" آنکھوں میں نمی کا احساس ہونے لگا لیکن بقول مُلّا ؎

اسے آنسو نہ کہہ اک یادِ ایامِ گزشتہ ہے

میری عمرِ رواں کو عمرِ رفتہ کا سلام آیا

میں نے عزم کر لیا کہ اپنی علمی کم مائگی کے باوصف ان مبارک لمحات اور ان پُربہار شخصیات کو کسی نہ کسی شکل میں محفوظ کرنے کی کوشش کروں گا۔ ابتداء تو میں نے کر دی لیکن آہستہ آہستہ احساس یہ ہوا کہ اس مقصد کے لئے جس فراغت و یکسوئی اور جس ماحول کی ضرورت ہے مجھے وہ میسّر نہیں۔ چنانچہ کئی سال تک ایک حرف کا اضافہ بھی نہ کر سکا۔ مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ جو کچھ حیطۂ تحریر میں آ چکا ہے اُسے "جلد اوّل" کے طور پر محفوظ کر لیا جائے۔ اگر ربِّ ذوالجلال والاکرام کو منظور ہوا اور زندگی نے مہلت دی تو دوسری جلد بھی مکمل ہو جائے گی۔

عزیز لکھنوی کا یہ شعر ؎

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا

ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

کئی باقاعدہ دیوانوں سے زیادہ وزنی اور دلآویز ہے۔ میں نے اپنی یادداشتوں کے لئے اسی شعر سے خوشہ چینی کی اور انہیں 'عمرِ رفتہ' کے نام سے موسوم کر دیا۔

صاحبزادہ محمد مقصود الرسول

مورخہ: ۱۴ ستمبر ۱۹۸۹ء — ۵۶۳ - عمر بلاک علامہ اقبال ٹاؤن

لاہور

Marfat.com

للہ شریف

ع لبوں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا۔

میں ایک طویل عرصہ اِس مملکتِ خداداد کے شہروں، دیہاتوں، محلّوں اور گلیوں میں مدّتوں گھومتا رہا۔ میں نے ان گنہگار آنکھوں سے وہ دلدوز مناظر دیکھے ہیں جن کے تصوّر سے دل کانپ اُٹھتا ہے۔ میں نے آشنا چہروں کو اِس طرح دفعتاً بدلتے ہوئے دیکھا ہے۔ جیسے کبھی وہ صفِ دوستاں میں شامل نہ تھے۔ میں نے محبتوں کے شہر کو نفرتوں اور حقارتوں میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے۔ میں نے انسان کے سینے میں دل کی بجائے پتھر دیکھے ہیں۔ میں نے بلند پہاڑوں کو اپنی جگہ سے سرکتے ہوئے دیکھا ہے۔

میں تہذیبوں کے ارتقاء اور پھر انسان کے عروج و زوال کی داستان سے بڑی حد تک آگاہ ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آقائے دو جہاں، سرورِ کائنات، محبوبِ خدا، پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اُمّت نے کب "رسم و رہِ خانقہی" چھوڑی اور کب کبھی نہ ختم ہونے والی تاریکیوں کی خوفناک زنجیروں میں جکڑی گئی۔ ہم وہ تھے جن کے آباؤ اجداد کے قدموں سے اُٹھنے والی خاک، اپنے بے مثال جوہر سے بُجھے چراغوں

Marfat.com

کو روشنی عطا کر دیتی تھی اور دہی ہم ہیں کہ اندھی غاروں میں کسی خونخوار بھیڑیئے کی طرح جبڑے پھاڑے ہمارے انتظار میں ہیں۔

یہ آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنیوں کا سیلاب اور جگمگ کرتے ہوئے بارونق شہروں میں بسنے والی فراواں مخلوق کدھر جا رہی ہے ــــ انہیں راستہ کیسے ملے گا۔ ان کے دلوں میں تہہ در تہہ اندھیرے دبے ہوئے ہیں۔ جب انسان کا اندر سیاہ اور تاریک ہوتا ہے تو باہر کی مصنوعی روشنی کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔

"کاغذی پیرہن" میں مقید ہونے کے باوجود میری روح میں نامعلوم اُمید کی ایک کرن موجود تھی۔ اس نیلے آسمان کے نیچے آسمانوں سے بھی اُونچے اور بلند لوگ موجود ہیں جن کو پوچھ کر زمانہ اپنی منزلیں متعیّن کرتا ہے۔ یہ عالی مرتبہ بزرگ جب قدم اُٹھاتے ہیں تو درختوں کی شاخیں جُھک کر سلامی پیش کرتی ہیں۔ جب وہ اپنے متبرک دامن کو جھٹکا دیتے ہیں تو شہنشاہوں کی قبائیں اپنی نامعقولیت پر شرمندہ ہو جاتی ہیں ــــ یہ اُونچے اور بلند لوگ کہاں ہیں؟

صاحبزادہ مقصودُ الرّسُول صاحب کی زیرِ مطبوعہ کتاب "عمرِ رفتہ" کا مسوّدہ میرے مطالعے میں نہ آتا تو شائد میری معلومات میں بڑی حد تک کمی رہ جاتی۔ اُدھر "مصنّف" نے عمرِ رفتہ کو آواز دی اور اِدھر وہ تمام تر خیالات اُمڈ کر گہرے بادلوں کی طرح میرے ذہن پر چھا گئے جن کا میں اُوپر ذکر کر آیا ہوں۔

صاحبزادہ مقصودُ الرّسُول صاحب سے پہلی مختصر ملاقات کے بعد میرا اندازہ تھا کہ انہوں نے اپنے پیشہ وارانہ تجربات کو یادداشتوں کی صورت میں یکجا کر دیا ہوگا۔ وہ ایک ایسے ادارے سے متعلق ہیں جہاں آئے دن عجیب و غریب واقعات سے

Marfat.com

دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اِس اعتبار سے میرا کام بڑا آسان تھا کہ میں کچھ دیر کے لئے شریکِ سفر ہو کر، اُن تجربات سے لطف اندوز ہو جاتا۔ مگر "عمرِ رفتہ" ایک سرکاری افسر کے معمولات نہیں ہیں بلکہ یہ تو آئینے کی کرچیاں لے کر دل و دماغ میں اُترنے والی باتیں ہیں۔ یہ تو داستان ہے اہلِ کرم کی، صاحبِ وجاہت و حشمت کی اور اُس ذی وقار شخصیت کے ماحول کی، جو حدود و کون و مکان سے آگے نکل چکا ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ یہ دُنیا ایک سرائے ہے۔ یہاں لوگ آتے ہیں۔ کچھ دیر پڑاؤ ڈالتے ہیں اور کسی سُلگتی ہوئی رات کو خیمے کی طنابیں توڑ کر گذرتے ہوئے لمحوں کے ساتھ فنا ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کچھ صاحبِ طریقت و فضیلت اس طمطراق اور شان سے "سرائے" میں آتے ہیں کہ روشنی کا مینار بن کر کھڑے ہو جاتے۔ بھولے بھٹکے مسافروں کو راستہ دکھلاتے ہیں۔ وہ اس دُنیا کی ناپائیدار مخلوق سے قطعاً مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ مختلف اس طرح کہ وہ اس آلودہ دُنیا میں رہتے ہوئے بھی ماورائے دُنیا ہوتے ہیں۔ یہ غالب کے "پری چہرہ" لوگ ہیں۔ یہ اقبالؔ کے مردِ مومن ہیں اور "عمرِ رفتہ" کو پڑھنے کے بعد صاحبزادہ مقصود الرسول صاحب کے والدِ گرامی، حاکم مملکتِ اللہ شریف ہیں۔

میں نے دانستاً "حرفِ مدعا" کا آغاز اللہ شریف سے کیا ہے۔ میں قریہ قریہ اور نگری نگری کا مسافر، اُسی علاقے کا پروردہ ہوں اور اُنہیں ہواؤں میں سانس لیتا رہا ہوں جہاں اللہ شریف کا "خطۂ امن" موجود ہے۔ پتہ نہیں کہ مجھ سے کونسی خطا سرزد ہوئی جو آج تک "خطۂ امن" کے اِردگرد گھومتا رہا لیکن وہاں کے لازوال تقدّس سے فیضیاب نہ ہو سکا۔ مگر "عمرِ رفتہ" کی مضبوط گرفت نے میری بے بہا

خواہش کی تکمیل کر دی اور میں اَب تک اپنے وجود سے نکل کر للّٰہ شریف میں موجود ہوں جسے میں خطّۂ امن کہہ رہا ہوں۔ اسلام بنیادی طور پر سلامتی کا دین ہے اور مجھے للّٰہ شریف کی حدود میں سلامتی کے سارے لوازمات نظر آئے۔

عمرِ رفتہ — ایک زبردست سفر کی پہلی منزل ہے۔ یعنی جلد اوّل۔ حیران کُن بات ہے کہ صاحبزادہ مقصود الرسول صاحب کی قوّتِ مشاہدہ اس قدر شدید ہے کہ انہوں نے نہایت کم عمری میں بزرگانِ دین کے اطوار کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا اور ایک ایک لمحے کو لوحِ فکر پر نقش کرتے چلے گئے۔ اپنے والدین سے عقیدت کا آتنا بڑا مظہر ابھی تک میری نگاہ سے نہیں گزرا۔ والدین کا مرتبہ اور مقام تو ہر مسلمان پر ظاہر ہے مگر مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ عمرِ رفتہ کے مصنّف نے محبت واحترام کی ایسی مشعل روشن کی ہے جو آنے والی نسلوں اور اُن کے بعد آنے والی نسلوں کو بھٹکنے سے محفوظ رکھے گی۔

میرزا غالب نے جب یہ کہا تھا کہ "آبگینہ تندئ صہبا سے پگھلا جائے ہے" تو یہ سارا پیرایہ اظہار الفاظ کی کوتاہئ معنی سے تعبیر تھا۔ کچھ ہستیاں اتنی بڑی ہوتی ہیں کہ الفاظ اپنے کم وسیع ہونے کا گلہ کرتے ہیں۔ یہی عالم "سربراہِ للّٰہ شریف" کی جہانگیر صفت شخصیت کے ساتھ ہوا ہے۔ وہ ایسے مقام پر جلوہ فگن تھے کہ "کم نظراں" کو وہاں تک رسائی کیسے ہو۔

صاحب زادہ مقصودُ الرّسُول صاحب نے اپنے بلند مرتبہ والد کے علاوہ اپنے دیگر رشتہ داروں، عزیزوں اور خاصانِ محفل کا جس خوبصورت انداز سے ذکر کیا ہے وہ اپنی جگہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ سعادت مندی کا یہ عالم ہے کہ

Marfat.com

بلّٰہ شریف کے معمولی مکین کو بھی بے حد خلوص سے یاد کیا ہے۔"عمرِ رفتہ" میں مصنّف کے نانا محترم کے خدوخال اور مجلسی زندگی کے آداب اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ ایک چمن کھل اُٹھتا ہے۔

میں نے عمرِ رفتہ کے مطالعہ سے محسوس کیا ہے کہ مصنّف کو اُردو، فارسی، عربی اور پنجابی پر کمال حاصل ہے۔ خاص طور پر فارسی اشعار کا استعمال اس قدر برجستہ اور برمحل ہے کہ داد دیئے بغیر چارۂ کار نہیں رہتا۔ اُن کے اسلوب سے ہر شعر اپنے پورے معنوی دروازے کھول دیتا ہے۔ اِس کے علاوہ مصنّف کو اپنے قلم پر مکمل اختیار حاصل ہے۔ وہ لفظوں کی قیمت سے آشنا ہیں۔ شان و شکوہ کے مواقع پر انہوں نے وہی زبان استعمال کی ہے جو مرتبے کے مطابق تھی۔ اپنی کم عمری کے باوجود، مصنّف نے اُن تمام واقعات کا پُرزور اور پُراثر احاطہ کیا ہے جن سے شخصیت کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ عمرِ رفتہ میں بلّٰہ شریف کا نقشہ ایسے اُبھرتا ہے جیسے یہ ایک مثالی ریاست ہو۔ اِس ریاست میں کوئی بدعنوانی نہیں، کوئی بددیانتی نہیں اور یہاں کوئی بھوکا پیاسا نہیں ہے۔ اسی بات سے عیاں ہوتا ہے کہ اس مثالی ریاست کا نگران تڑپتی ہوئی انسانیت کی فلاح کے لئے کیا سوچ رہا ہوگا۔

صاحبزادہ مقصودُالرّسُول صاحب نے اپنے معزز، قابلِ احترام اور شفیق و مہربان والد کے آخری لمحات کا ذکر اس پُرسوز طریقے سے کیا ہے کہ اہلِ دل پہ ایک رقّت طاری ہو جاتی ہے۔ ایک بہت بڑا آدمی اس دُنیا سے رخصت ہو رہا تھا۔ مگر واضح اعلان کے باوجود دل میں دھڑکن تھی اور چہرے سے روشنی

Marfat.com

پھوٹ رہی تھی۔ اگلی دُنیا کا مسافر جانتا تھا ؂

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤنگا

میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤنگا

دل کا دھڑکنا اور پھول کی پتیوں کا کانپنا، اس بات کی دلالت ہے کہ ایسے لوگ اپنے پیچھے رشد و ہدایت کا ایک بہت بڑا خزانہ چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ خزانہ آنے والے دور کو منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یہ سفرِ آخرت دراصل روشنی کا سفر ہے۔ روشنی کی صرف یہی فطرت ہے کہ وہ شہروں، دیہاتوں، گلیوں اور دلوں کو روشن رکھے۔ صاحبزادہ مقصود الرسول صاحب نے اس روشنی کو عمرِ رفتہ میں سجا دیا ہے

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ فیاض اور سخی لوگ ہر رنگ میں اپنا پسندیدہ رنگ تلاش کر لیتے ہیں۔ پرانے فلمی گیتوں میں تصوّف کا پہلو اجاگر کرنا ایک عمدہ مثال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پُرانے گیت دراصل حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کے کلام سے اخذ کئے گئے تھے۔ ان گیتوں میں یہ رنگ بہت عرصہ تک موجود رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گیت آج بھی زندہ ہیں جن کا رشتہ اُس درگاہ سے ملتا ہے۔ اس بات کو عمرِ رفتہ کے مصنّف نے بڑی چابکدستی سے بیان کیا ہے۔

جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی ریاست پاکستان اُس کے بانی کا تذکرہ ظاہر کرتا ہے کہ ہمارے بزرگ کیا سوچ رہے تھے اور یہ کہ وہ سچائی کو کس طرح عام کر رہے تھے۔

صاحبزادہ مقصودُالرسُول صاحب نے اپنے اساتذہ کرام کا احوال اس خوبی اور خلوص سے لکھا ہے کہ آج کے مُعلّم اور شاگرد کو سبق سیکھنا چاہیئے۔

Marfat.com

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ عمرِ رفتہ کی پہلی جلد ہے۔ ابھی میری تشنگی باقی ہے اور ورق تمام ہوا ـــــ دُعا یہ ہے کہ قارئین کرام اس کتاب میں وہ باتیں بھی پڑھ لیں جو بین السطور اپنا مطلب ادا کر رہی ہیں۔

عبدالقادر حسن

۹/ اکتوبر ۱۹۸۹ء

Marfat.com

نمودِ صبح

اعلیٰ حضرت للّٰہی قدّس سرّہ العزیز کے بیاض مبارک میں میری تاریخ پیدائش ۴ر اگست ۱۹۳۲ء درج ہے۔ ہجری تقویم کے مطابق یہ ۱۳۵۱ ہجری ہوگی۔ ابھی کچھ لوگ باقی تھے جہاں میں۔ چنانچہ اکثر صاحب علم لوگ ہمارے خاندان میں ولادت کے موقع پر مبارکباد کو منظوم شکل میں پیش کرتے اور نظم کے مقطع سے تاریخ پیدائش نکالتے۔ میری تاریخ پیدائش مولینا عبدالرّسول صاحب بکھروی نے آخری شعر کے آخری مصرع میں سے نکالی۔

گرفتہ یا ولی تاریخ گفتم   روئے مقصود شد ماہِ سعادت

پوری نظم یوں ہے۔

چو مقبولِ رسولِ اہلِ نیابت   شہِ تختِ ولایت ہم سیادت
بُشَّر شد بہ پسرِ نیک اختر   کہ بادا عمرِ اُو اندر زیادت
گرامی اسم مقصود الرّسول است   (شدہ مسرور ہر کس فوق عادت
بعبد آمدز مجبوب امرِ تاریخ   برنجوریِ اُو بعد از عیادت
گرفتہ یا ولی تاریخ گفتم   روئے مقصود شدہ ماہ سعادت
۱۳۵۱ھ

ایسی نظمیں غالباً عقیدتمند محض اظہارِ عقیدت کے طور پر لکھتے ہیں اور پھر اُنہیں اپنے مُرشد کی خدمت میں اُن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے پیش کر دیتے۔ اِس ضمن میں ویسے تو ہر کوشش نہایت قابلِ قدر اور قابلِ ستائش ہوگی۔ لیکن جو بات اِس نظم

Marfat.com

میں تھی۔ جو مولینا سلام اللہ صاحب شائقؒ ساکن چک عمر ضلع گجرات نے میرے والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ کی پیدائش پر قلمبند کی۔ مجھے کسی دوسری کوشش میں نظر نہ آئی۔ اشعار میں بے ساختگی الفاظ میں برجستگی اور دیگر شعری محاسن اِس میں ایسے یکجا ہو گئے کہ اُس کی تعریف سے کم سے کم میرا قلم قاصر ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیفیت صرف میرے ہی لئے مخصوص ہے یا کوئی اور بھی اِس میں شریک ہے۔ بہر حال اِس کے پڑھنے سے وارداتِ قلب میں ایک عجیب قسم کا تغیّر رونما ہونے کے بعد دلِ ناصبور متاعِ گم گشتہ کی تلاش میں زبردست احساسِ محرومی سے دوچار ہو جاتا ہے اور بالآخر ماضی کی پُر فیض اور سکون بخش یادوں کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور۔ میں تبرکاً اِس پوری نظم کو درج ذیل کر رہا ہوں۔

شکرِ للّٰہ آنکہ در للّٰہ شریف — و از عطیاتِ خدائے ذوالمنن
گلشنِ بادِ خزاں گردید دُور — سبزہ از بادِ بہاری شُد چمن
در شبستانِ جنابِ عبدالرسولؒ — شُد فروزاں شمعِ کافوری لگن
بار آور گشت نخلِ نقشبند — یا رسید ایں نافہ از مُشکِ ختن
قمریان و عندلیبانِ ہزار — تہنیت گویاں بآوازِ حَسن
نرگس اندر باغ مشتاقِ جمال — تا بہ بیند روئے پاکِ گُل بدن
دستِ خود افراشتہ ہر دم چنار — از پئے دعواتِ آں غنچہ دہن
نیّرِ اقبالِ او تاباں بُود — تا قیامت در سلامت از فتن
پرورش یابد بصد اعزاز و ناز — در قماطِ عصمت از رنج و محن
شائقؒ از فرمائشِ یارانِ خویش — چُوں مقیّد شُد چُوں بُز اندر رسن
بے سر اندیشہ سالِ زادنش — گفت "شمعِ خاندانِ قطبِ زمن"

۱۳۲۴ھ

Marfat.com

یہ پوری نظم والد محترم نے میری "نعتوں والی کاپی" منگوا کر میری موجودگی میں اپنے دستِ مبارک سے رقم فرمائی۔ اُس روز بڑے خوش خوش تھے اور نہایت خندہ روئی اور متبسّم چہرہ سے سارے اشعار لکھتے رہے۔ افسوس کہ تاریخ تحریر درج نہیں اور نہ اُس وقت اِس صفحہ کے متبرک اور تاریخی اہمیت کے حامل ہونے کا کوئی احساس تھا تاہم گمان غالب یہ ہے کہ یہ ۱۹۴۵ء کی گرمیوں کی کوئی دوپہر تھی۔ گھر کے درمیانے کمرہ میں انہوں نے کرسی پر بیٹھ کر کھانا تناول فرمایا اور نہایت ہلکے پھلکے موڈ میں یہ جنس گراں ہمیشہ کے لئے مجھے عطا فرما دی۔

بچپن کی قدیم ترین یاد جو میرے ذہن کے دور دراز نہاں خانوں میں ابھی تک محفوظ چلی آ رہی ہے۔ وہ دادی جی بی کرم بی صاحبہ مرحومہ مغفورہ کا وہ شمالی کمرہ ہے جو پُرانے گھر میں تھا اور جہاں میں اِن کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ میں دراصل بلحاظ تقسیم اِن کا "بیٹا" تھا اور وہ مجھ سے بے حد پیار کرتے تھے۔ وہ درسِ قرآن مجید بھی دیتے تھے۔ اور اپنی شاگرد بچیوں کو خوب ڈانٹتے لیکن اِن کا پُرخلوص دستِ شفقت ڈانٹ ڈپٹ کی تلخیوں کو حلاوت اور شیرینی میں تبدیل کر دیتا وہ مجھے کھانا اپنے پاس بٹھا کر کھلاتے اور میرے "حقوق" کے لئے دوسرے اہلِ خانہ سے جھگڑا بھی کر لیتے۔ یہ غالباً ۳۷-۱۹۳۶ء کی بات ہوگی۔ چائے اُس زمانہ میں ایک اجنبی قسم کا مشروب متصوّر ہوتا۔ لیکن وہ چائے کے بڑے رسیا تھے اور اِس کے لوازمات میں تقریباً خود کفیل دودھ بکری کا استعمال کرتے۔ جس کی نگہداشت اکثر اوقات وہ خود کرتے۔ میری اوّلین یادداشت کے مطابق انہوں نے ایک بھُورے رنگ کی بَربالی، بکری پال رکھی تھی جس کا وہ بڑا خیال رکھتے اور گھر منگوا کر اِس کی مزید خاطر مدارات، کرتے۔ ایک مرتبہ

Marfat.com

برادرِ عزیز صبغتہ اللہ صاحب نے اسے روٹی کے خشک ٹکڑے کھلا دیئے اور وہ مر گئی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اِس بکری کی اچانک موت میرے دل کی شفّاف سلیٹ پر باقاعدہ ایک نقش چھوڑ گئی۔ "اطریفل زمانی" کا لفظ میں نے انہی کی زبان سے سُنا۔ سیاہی مائل کوئی معجون نما چیز تھی۔ اِسے نہایت پُرانے ڈبوں میں محفوظ رکھتے۔ اور رات کو سونے سے قبل کبھی کبھی استعمال فرماتے۔ ستم ظریفی یہ کہ بعض اوقات اِس پروگرام میں مجھے بھی شامل کر لیتے اور میں نہایت بے دلی سے اِسے سزا کے طور پر قبول کر لیتا۔ بڑی پھیکی اور بدذائقہ قسم کی کوئی چیز ہوتی تھی۔

یہی وہ زمانہ ہے۔ جب والدِ محترم اپنی مردانہ نشست گاہ یعنی "بنگلہ" اور "شیش محل" سے شمالی گھر کے طویل صحن سے ہوتے ہوئے مغربی کونہ پر پہنچ کر جنوبی گھر میں داخل ہوتے اور پھر دالان، سے گزر کر ایک بالکل مختصر لیکن نہایت روشن اور ہوادار کمرہ میں آکر بیٹھ جاتے۔ بعد میں یہی کمرہ برادرِ محترم صاحبزادہ عبدالرسول صاحب کے لئے ایک عرصہ تک مختص رہا۔ یہ اُن کے دوپہر کے کھانے کا معمول تھا۔ وہ جب آتے تو ان کی آمد آتنی پُرشکوہ ہوتی کہ سارے ماحول اور در و دیوار پر گویا ایک لرزہ طاری ہو جاتا۔ ہر فرد و بشر نگاہیں جُھکا کر ادب و احترام کی تصویر بن جاتا۔ وہ خود اِس طرح چلتے کہ نگاہیں قدموں پر مرکوز ہوتیں۔ وہ دائیں بائیں دیکھنے کے بالکل عادی نہ تھے۔ ایسا لگتا کہ کوئی فوق البشر ربِّ ذوالجلال کے اذنِ خاص سے چلتا ہوا آگے آ رہا ہے۔

اس گھر کا صحن مکمل طور پر کمروں سے محدود لیکن کشادہ تھا۔ صحن کے درمیان میں تقریباً بارہ بارہ فٹ کے طول و عرض کا ایک بڑا روشندان (مگھ) تھا۔ جس سے روشنی نچلی منزل میں پہنچتی۔ یہ "گراؤنڈ فلور" تقریباً غیر آباد تھا اور اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود

ایک سٹور کے طور پر مستعمل۔ البتہ ایک معمر ترین درویش "باباخان" کی رہائش مجھے اِس میں یاد ہے۔ مولینا فضل دین از وکلیکہ، (علاقہ نسوان) ضلع نوشاب) المعروف "مولوی ڈورہ صاحب" جو نہایت باشرع اور پرانی وضع کے عالم باعمل تھے۔ اسی 'نگھ' سے جمعہ کے روز بوقت چاشت مستورات کے لئے 'مسئلے' بیان کرتے۔ قصبہ کی خواتین کافی تعداد میں یہ 'مسئلے' سُننے کے لئے جمع ہوتیں اور جمعہ کا دن ایک پُر لطف گہما گہمی اور رونق میں گزرتا۔ مولینا فضل دین (رحمتہ اللہ علیہ) والدِ محترم اور چچا جان کے اُستاد بھی تھے اور اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ العزیز کے کُتب خانہ کے انچارج بھی۔ پرانی مسجد (مسجد پختہ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ العزیز) کے شمال مشرقی کونہ میں یہ انتہائی نادر قلمی نسخے اور بیش بہا دینی کتابیں اِن کی تحویل میں ہوتیں۔ والدِ محترم اکثر نماز سے فارغ ہو کر اِن سے نہایت پیار اور پورے احترام کے ساتھ فارسی میں گفتگو کرتے مولینا بعد میں ہمیں بھی ابتدائی تعلیم دیتے رہے۔ وہ "گراں گوش" تھے۔ لہٰذا اِن سے تعلیم و تعلّم خاصا مسئلہ تھا۔ تاہم جناب برادرِ بزرگوار صاحبزادہ محمد مطلوب الرسول صاحب سجادہ نشین، صاحبزادہ عبدالرسول صاحب اور مجھے اِن کے شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے۔

بڑے مائی صاحبہ رحمتہ اللہ علیہا اِس گھر کے مغربی حصّہ کی ایک کوٹھڑی میں رہتے۔ جہاں اِن کی اجازت کے بغیر کسی کا گزر ممکن نہ تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عمِّ محترم جناب حضرت صاحبزادہ محمد محبوب الرسول صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا ستمبر ۱۹۷۱ء میں انتقال ہوا۔ مائی صاحبہ ایک انتہائی قابلِ احترام شخصیت تھے۔ وہ ہمارے خاندان کے معمّر ترین فرد ہونے کے علاوہ ثالث حضرت رحمتہ اللہ علیہ کی ہمشیرہ بھی تھے۔ لہٰذا ہر کہ و مہ کے لئے یکساں طور پر واجبُ التعظیم۔ وہ صحیح معنوں میں ایک بادشاہ قسم کی خاتون ہونے کے

Marfat.com

ساتھ ساتھ زہد و اتقاء کا مجسمہ بھی تھے۔ صبح صبح قصبہ کی چند نیک سیرت خواتین علیحدگی میں اِن کے سامنے بیٹھ کر باقاعدہ مراقبہ کرتیں۔ اِن کے حکم سے سرتابی کی کسی کو مجال نہ تھی۔ سبز چائے استعمال فرماتے اور اِن کی خادمائیں اِسے تیار کرنے کی خاص مہارت رکھتی تھیں۔ دوپہر کا کھانا اُوپر بنگلہ المعروف "ماڑی" میں تناول فرماتے۔ لیکن اِس شان کے ساتھ کہ اُس وقت کسی کو بھی اُس طرف سے گزرنے کی ہمّت نہ ہوتی۔ میں البتہ اِس اصول سے مستثنےٰ تھا۔ یہاں تک کہ مجھے خاص طور پر بلوا کر کھانے میں شریک کر لیتے۔ ایک دو چڑیاں جو اِسی بنگلہ میں رہتی تھیں۔ اِن سے خاصی بے تکلّف تھیں اور باقاعدہ کھانے میں شریک ہوتیں۔ تاہم میری موجودگی اِن کے لئے بڑی بدمزگی کا باعث بنتی۔ وہ جب شور مچا کر اِس "دخل در معقولات" پر احتجاج کرتیں تو "مائی صاحب" دبی زبان میں اُنہیں خفا ہوتے اور مُسکراتے۔ کھانا کھلانے کی خدمت مائی فیض بی صاحبہ مرحومہ کے ذمّہ تھی۔ جسے اِس نیک کردار خاتون نے کمال خلوصِ نیّت سے نباہا۔ وہ ایک اچھے خاندان سے تعلّق رکھتی تھیں اور ہمارے گھر میں اُنہیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

حضرت مائی صاحبہ کا یہ معمول جو میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ تقریباً ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۱ء تک رہا۔ اِس کے بعد معمولات میں تو کیا فرق آنا تھا البتہ مقامات کی تعیین مجھے یاد نہیں۔

Marfat.com

انقلابِ مسکن اور مکتب سے تعارف

۱۹۳۸ء کے لگ بھگ ہمارے گھر میں ایک چھوٹا سا انقلاب آیا اور وہ یہ کہ والدِ محترم اور چچا جان نے اپنے اپنے رہائشی حصے آپس میں تبدیل (EXCHANGE) کر لئے۔ اب ہم گویا اپنے رہائشی مکان کے اُس حصّہ میں منتقل ہو گئے۔ یہاں پھر ایک طویل عرصہ تک قیام رہا اور زمانۂ ہوش کی بیش تر قیمتی یادیں اور ناقابلِ فراموش واقعات اسی گھر اور ماحول سے وابستہ ہیں۔ یہ گھر نسبتاً غیر وسیع اور مختصر تھا۔ بلکہ شروع شروع میں تو صرف دو رہائشی کمروں پر مشتمل تھا۔ شمالی کمرہ میں اُمّی جان مع اپنے افرادِ کُنبہ کے رہتے اور جنوبی کمرہ جو مقابلتاً روشن اور فراخ تھا، میں بی کرم بی صاحبہ مغفورہ قیام پذیر۔ حضرت مائی صاحبہ اور بی کرم بی صاحبہ دونوں بزرگ خواتین والدہ ماجدہ سے بڑی محبت رکھتی تھیں اور ان کے دُکھ درد میں باقاعدہ شریک ہوتیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ اِس تقسیم کے نتیجہ میں افرادِ کُنبہ بھی بٹ گئے اور خدّام یعنی درویش صاحبان کی بھی اُلاٹمنٹ ہو گئی۔ حضرت مائی صاحبہؒ اور بی کرم بی صاحبہ ہمارے حصّہ میں آئے جبکہ دادی جان ٹھٹھے والے اور ماجی صاحبہ جناب عمِّ محترم کے حصّہ میں۔ اِسی طرح میاں محمدؒ صاحب احمد آبادی، بدر دین مرحوم (سگھر) غلام رسول چکوڑوی، نور دین (اللہ شریف) اور فقیر از کھو کھر زیر۔ والدِ محترم سے منسلک ہوئے تو رمضان چدھڑ، رمضان ڈاچی والا، منشی فضلا، میاں زیادہ اور دُصاحب جادہ، عمِّ محترم کے لئے مخصوص ہو گئے۔

Marfat.com

ویسے تو یہ سب لوگ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ العزیز کے خادمانِ خاص میں سے تھے اور یقیناً اِن کے منظورِ نظر بھی۔ لیکن جو بات میاں محمد صاحب احمد آبادی میں تھی، مجھے کسی اور میں نظر نہ آئی۔ وہ بڑے شب زندہ دار اور متقی انسان تھے۔ خاموش طبع اور اپنے کام سے مطلب رکھنے والے۔ چہرہ ایسا نورانی کہ

"کیف مدّ ظلّ نقش اولیاست کو دلیلِ نورِ خورشیدِ خداست"

کی زندہ تفسیر۔

رمضان شریف کے شبینوں میں انتہائی ضعف کے باوجود بعض اوقات بحالت قیام واحد سامع رہ جاتے۔

اُن دِنوں ہر گھر میں شبینوں کا رواج نہ تھا اور نہ ہی رمضان شریف کے علاوہ کبھی کوئی محفلِ شبینہ سُننے میں آتی۔ 'شبینہ' باقاعدہ نماز نوافل میں ہوتا اور سامعین میں سے بھی آرام کے وقفوں سے باقاعدہ نمازیں شریک ہوتے رہتے۔ میاں محمد صاحب البتہ شام سے لے کر سحر تک بغیر کسی وقفے کے کھڑے کھڑے قرآن پاک سُنتے اور ہم حیرت سے اِن کا مُنہ تکتے رہ جاتے۔ عنفوان شباب میں ثانی حضرت قدس سرہٗ العزیز سے بیعت کی اور عمر بھر کے لئے 'پیر خانے' ہی کے ہو کر رہ گئے۔ نہایت بہادر اور طاقتور نوجوان تھے اور ہَل چلانے میں سب سے آگے ہوتے۔ آہستہ آہستہ عمرِ رواں ڈھلتی گئی۔ یہاں تک کہ ہر فرض سے سُبکدوش ہو کر صرف ایک تبرّک کی صورت اختیار کر گئے اور عہدِ رنگین کی یادگار ہوں میں۔ یعنی اپنا ہی سوگوار ہوں میں کی تصویر یہ تا ثیر۔ اُنہوں نے اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ العزیز کو زمانۂ ہوش میں دیکھا تھا۔ کبھی کبھی اِس زیارت کی تفصیل جب سُناتے تو یُوں کہ "دلوں میں اِن کے سیلِ گریہ ہوگا۔ اگر با دیدۂ پرنم نہ ہونگے"

Marfat.com

اِن کی وفات اکتوبر ۱۹۵۶ء میں ہوئی اُنہیں جب لحد میں اُتارا گیا تو نانا جان حضرت مفتی عطا محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُوپر سے اِن کا کھلا ہوا روشن چہرہ دیکھ کر پکار اُٹھے۔ لِمِثۡلِ هٰذَا فَلۡيَعۡمَلِ الۡعٰمِلُوۡنَ۔

رمضان چدّھڑ ایک زندہ دِل اور خوش طبع انسان تھا اور والدِ محترم کا ابتدائی دَور میں نہایت معتمد۔ نور دین پرخوری میں بدنامی کی حد تک مشہور لیکن خدمتگار اور اپنے پیرخانہ سے والہانہ عقیدت رکھنے والا۔

بہر حال اِس 'انقلاب' سے درویش حضرات کی ذمّہ داریاں اور کسی حد تک وفاداریاں بھی متعیّن ہوگئیں۔ ہمارے گھر والے رہائشی حصّہ کو ایک "گھر" کا نام دینا ایسا ہی تھا جیسے برقی پنکھے کے تین بلیڈوں کو مکمل "پنکھا" سمجھ لیا جائے یا جلد بندی کے دو گتوں کو پوری "کتاب"۔

اِس "گھروں سے معذرت کے ساتھ" گھر میں جن جن عملی مشکلات کا والدہ ماجدہ کو سامنا کرنا پڑا اِن کا تصوّر آج کے زمانہ میں ممکن نہیں اور جس صبر و تحمّل سے اُنہوں نے یہ سب کچھ برداشت کیا۔ یہ بھی اُنہی کا کمال تھا۔ غالباً ایسی ہی مشکلات کا احساس کرتے ہوئے اُس زمانے میں تقریباً گاؤں سے باہر "شوکیاں والے ٹوٹے" سے متصل والدِ محترم نے مستری فتح محمد صاحب بھلوال کی نگرانی میں ایک نہایت خوبصورت بنگلہ نما عمارت بنانے کا پروگرام بنایا اور تھوڑی ہی مدّت میں یہ عمارت تیار بھی ہوگئی۔ اِس عمارت کی چھت روایتی چھت نہ تھی بلکہ سیمنٹ، سریا اور اینٹ کے مرکّب سے تیار کی گئی تھی۔ چنانچہ اِس علاقہ میں لوگ لینٹل کی چھت سے پہلی بار متعارف ہوئے لیکن افسوس کہ ہمارے معمار حضرات کچھ زیادہ پختہ کار ثابت نہ ہوئے اور "لینٹر" کو موسم کی دَست بُرد سے

Marfat.com

محفوظ رکھنے کی کوئی تدبیر نہ کر سکے۔ ورنہ شائد ہم بہت پہلے ہی یہاں منتقل ہو چکے ہوتے۔ بہرحال اَب یہی عمارت بفضلِ اللہ تعالیٰ ضروری مرمّت کے بعد جناب بھائی صاحب کے زیرِ استعمال ہے اور آج بھی پختہ ترین عمارت سمجھی جاتی ہے۔ چونکہ لنگر کا سارا سلسلہ بھی رہائشی حصّوں ہی سے متعلّق تھا اور نئے بنگلہ میں منتقلی کی تجویز والدِ محترم نے اُس کی چھتوں کے "غیر پختہ" ہونے کی بناء پر ترک کر دی تھی۔ لہٰذا کچھ عرصہ بعد لنگر والے حصّہ المعروف "تندوری" کو مسقّف کر دیا گیا۔ چنانچہ اِس کے مغربی حصّہ پر باورچی خانہ تعمیر کر کے مشرقی حصّہ کو ہم بطور صحن استعمال میں لے آئے۔ مغربی صحن کی شمالی دیوار جو پردہ کا کام دیتی تھی وہاں سے ہٹا دی گئی اور صحن کی حدود مسجد والی گلی تک وسیع ہوگئیں۔

اِس "انقلابِ مکانی" ہی کے دِنوں کی بات ہے کہ ایک نہایت شگفتہ اور رُوح پرور صبح کو والدِ محترم مجھے خانقاہ شریف میں اُستاد حافظ جی اللہ دتہ صاحبؒ کے دَرسِ قرآنِ مجید میں داخل کرانے لے گئے۔ والدِ محترم کے پیچھے ایک ہجوم بصورتِ قافلہ دست بستہ سَر جھکائے مسجد تک چلتا گیا۔ میں "بی غلام بی" صاحبہ مرحومہ از "طل طوطا"، ضلع راولپنڈی کے "کنڈھاڑے" پر سوار ایک نئی دُنیا سے متعارف ہونے چلا تھا۔ مجھے کوئی احساس نہیں تھا کہ والدِ محترم کا اِس طرح پیدل چل کر خانقاہ شریف تک جانا کتنی عجیب اور غیر معمولی بات تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ وہ "بھتّی مچھانی" کے گھر کی دیوار کے سائے میں چل رہے تھے۔ چل کیا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت انسانی شکل اختیار کرنے کے بعد ماحول کو منوّر کر رہی تھی۔ ایک کھاری میں مٹھائی تھی اور وہ اِس سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ اتنی وافر مقدار میں میں نے حلوائی کی دکان سمیت پھر مٹھائی نہیں دیکھی۔ اِس کے بعد کی تفصیل مجھے یاد نہیں کہ دَرس میں پہنچے تو کیا ہوا۔

پہلا حرف کس طرح ادا ہوا اور کس کے تلمذ میں۔ بہر حال اُستاد صاحب اللہ دتہؒ کے درس میں مَیں داخل ہو گیا۔

اُستاد صاحب ضعیف العمر تھے۔ لیکن اُن کا دبدبہ خوب تھا۔ نابینا تھے لیکن پھر بھی ہر شاگرد اِن کی "نگاہ" میں ہوتا۔ عمر کے آخری حصہ میں پہنچ جانے کے باوصف سخت گیر تھے۔ لیکن حفظِ قرآن مجید کے ضمن میں اُن کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا بخیلی کی انتہا ہو گی۔ بزرگ اتنے تھے کہ والدِ محترم کے بھی اُستاد۔ وہ کھانا جب کھاتے تو پیار کی علامت کے طور پر مجھے بھی اِس میں شریک کر لیتے۔ یہ کھانا بے حد لذیذ ہوتا بلکہ آج تک وہ لذّت کام و دہن مجھ سے فراموش نہیں ہو سکی۔

یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ حافظ جی مغفور کا یہ درس اُس درسِ پاک ہی کے تسلسل کا ایک نام تھا جو للّٰہ شریف میں اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ العزیز نے حضرت پیر قصوری دائم الحضوری قدس سرہٗ العزیز کی اجازت سے شروع کیا اور جو اِس وسیع تر علاقہ میں واحد درسِ قرآن پاک تھا۔ اِس مدرسہ سے اَن گنت لوگ حفظِ قرآنِ حکیم کی نعمت سے مالا مال ہو کر نکلے اور اِس نعمت کو مزید وسعت دینا اپنی زندگی کا مقصدِ وحید قرار دیا۔ میں ۱۹۶۲ء میں اپنی ملازمت کے سلسلہ میں جب اٹک (کیمبلپور) پہنچا تو ایک درویش صفت بزرگ سیّد میر احمد شاہ وہاں وکالت کرتے تھے۔ ایک آدھ ملاقات ہوئی تو پوچھنے لگے۔ "عزیز تم کہاں کے رہنے والے ہو" میں نے عرض کیا۔ "للّٰہ شریف ضلع جہلم کا" یہ سُنتے ہی وہ اچانک سنجیدہ ہو گئے اور اِسی حیرت زدگی کے عالم میں مجھے غور سے دیکھتے دیکھتے آبدیدہ ہو گئے پھر ایک لمبی آہ بھر کر فرمایا "بھلے زمانے میں وہاں درسِ قرآن پاک ہوا کرتا تھا اب تو یہ روایات ختم ہو چکی

ہوں گی۔" میں نے عرض کیا کہ درسِ قرآنِ حکیم للہ شریف میں اللہ تعالیٰ کے ایک مقرب خاص اور باکمال بزرگ حضرت مولینا غلام نبی قدس سرہٗ العزیز نے شروع کیا تھا اور انہی کی زندہ کرامت کے طور پر آج تک جاری وساری ہے۔ یہ سنتے ہی سیّد صاحب کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا اور پھر دیر تک وہاں سے فارغ شدہ حفّاظِ کرام کا تذکرہ محبت اور عقیدت کے جذبے سے کرتے رہے۔

اُس زمانے میں خاصے معمّر لوگ بھی حفظِ قرآنِ پاک سے دلچسپی رکھتے تھے اور طلباء کی تعداد خاصی تھی۔ افسوس کہ اِن سب کے نام مجھے یاد نہیں۔ البتہ ایک صاحب جو خاصے معمّر تھے "سائیں" کے نام سے معروف تھے اور اتنے "جہیر الّنیچھ" تھے کہ اِن کی چھینک سارے درس پر سنّاٹا طاری کر دیتی۔ ایک نابینا حافظ الموسوم "زیادہ" تھے۔ بڑے سیاہ فام میری یادداشت کے مطابق اِن کی تعریف اِس شعر کے بغیر ممکن نہیں ؎

ماہ را از ظلمتش دل داغ داغ
بر رُخش، خورشید محتاج چراغ

مسجد خانقاہ شریف اِن دنوں گاؤں سے باہر بالکل الگ تھلگ واقع تھی اور یہاں بالکل ہی ایک نئی دُنیا آباد نظر آتی۔ صرف کمہاروں کا محلّہ اور اُس سے متصل لیبن المعروف "شینے"، ترکھان وغیرہ کے آٹھ دس گھر اِس کے پڑوس میں واقع تھے جو بذاتِ خود ایک "سٹلائٹ ٹاؤن" کی حیثیت رکھتے تھے۔ مسجد کا اپنا ایک کنواں تھا اور مسجد کے حوض میں پانی پہنچانے کا انتظام نہایت معقول۔ ایک طویل نالی سرِ دیوار چلتی ہوئی "مٹ"، یعنی حوض تک پہنچتی۔ وضو کے لئے "پتنی" کافی لمبی تھی اور لوگ ٹوٹیوں کے پانی سے وضو کرتے۔ ایسا انتظام اُس زمانے میں بہت ہی خال خال تھا۔ مسجد کے فراخ

Marfat.com

اور کشادہ صحن سے ملحق املی اور کھجور کے درخت ماحول کو مزید تازگی اور تراوت بخشتے۔ الحمدللہ کہ یہ نشانیاں آج تک قائم ہیں۔ ماسوائے اُس "کھجور" کے جو طویل ترین تھی اور جس کے تنے سے ملحق ایک پرانے درویش "سخی بابا" کی "جُھگی" ہوتی تھی۔ سخی بابا کھجوروں کی حفاظت اِس طرح کرتے کہ اِن کے گُچھوں کے گرد "توبرے" چڑھا دیتے۔ اُس زمانے میں مُلحقہ زرعی زمین میں بیری کے دو پیوند شُدہ درخت بھی ہوتے تھے جو تقریباً ۱۹۵۶ء تک قائم رہے۔ اِن کے "سیاہ" بیر بڑے، موٹے اور خوش ذائقہ ہوتے۔ اِن کی حفاظت بھی سخی بابا کی ذمہ داری تھی۔ وہ ایک بڑی لمبی رسّی پرانے ٹین سے باندھ کر درخت سے لٹکا دیتے جسے وقفے وقفے سے اپنی جھگی سے ہی اِس طرح ہلاتے کہ اِس کا "کھڑکار" طوطوں میں بھگدڑ مچا دیتا۔ "سخی بابا" خشک مزاج اور سخت گیر تھے اور برعکس نام نہند زنگی کافور، کے مصداق انتہائی کنجوس۔ چنانچہ ایسے ماحول میں سیاہ بیر کھا لینا ہمارے نزدیک عیاشی سے کم نہ ہوتا۔ ایک دن بعد از نمازِ عصر والدِ محترم وہاں تشریف لے گئے تو سخی بابا نے ڈھیر سارے سُرخی مائل موٹے موٹے تازہ بیر از خود اِن کی خدمت میں پیش کئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ بابا جی نے یہ تحفہ بہ کمال نیازمندی و خندہ روئی سے پیش کیا۔ والدِ محترم نے خوشی خوشی ایک دو بیر اُٹھائے اور بقایا حاضرینِ مجلس میں تقسیم کر دیئے۔ یہ اِن کی زندگی کا ایک عام معمول تھا۔

ز گردوں فتد آنچہ بہ لالۂ من
فرو ریزم اُو را بہ برگ گیا ہے

میں حیران اِس بات پہ تھا کہ جو شخص اتنا "عبُوسا قمطریرا" ہو وہ اتنا نیازمند بھی ہو سکتا ہے؟ اور بیر جیسی نعمت کسی کو از خود بھی پیش کر سکتا ہے۔

Marfat.com

میں بہر حال اَب اِس دَرسگاہ کا باقاعدہ طالب علم بن گیا۔ اُستاد جی نے مستری غلام جیلانی کو مجھے گھر سے مکتب تک لانے کی ذمہ داری تفویض کی تھی۔ یہ شخص میرے وہم و گمان سے کہیں زیادہ ہوشیار ثابت ہوا اور میری مسجد تک نہ جانے کی ہر کوشش اپنی تدبیر سے ناکام بنا دیتا۔

اُستاد جی صاحبؒ کچھ عرصہ بیمار رہ کر انتقال فرما گئے تو اُن کے نائب حافظ نواب صاحب نے مسندِ تدریس سنبھال لی۔ نواب صاحب نہ تو اتنے آزمودہ کار تھے اور نہ ہی بہ لحاظِ احترام اتنے محترم تاہم درسگاہ کا کام چل نکلا۔ میں اَب دوسرے پارہ میں پہنچ کر 'سبق'، 'سَت سبق'، اور 'منزل'، کی اصطلاحوں سے آشنا ہو چکا تھا۔ دَرس میں جو مسجد کے اندر یا باہر دالان میں ایک مستطیل دائرے کی صورت میں ہوتا، چند جانے پہچانے چہرے ہمیشہ اپنی مخصوص جگہوں پر براجمان جھُول جھُول کر قرآن پاک پڑھتے ہوئے دکھائی دیتے۔ مختصراً یہ کہ خانقاہ شریف کا ماحول جو شروع شروع میں میرے نزدیک ناروا پابندیوں اور کھیل کُود کے خلاف ایک 'سازش'، سے عبارت تھا۔ اَب زیادہ اجنبی نہ رہا تھا۔ وہاں کے معمولات اَب زیادہ دِل شکستگی کا باعث نہ بنتے ہنسی خوشی پڑھنے جاتا اور اِسی طرح لوٹ آتا۔

Marfat.com

اینگلوورنیکولر مڈل سکول للہ

لیکن افسوس کہ یہ معمول زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوا اور ایک چمکیلی صبح کو باہر مسجد کے صحن میں سے والدِ محترم نے مجھے گھر بلوایا۔ معلوم ہوا کہ آئندہ پڑھنے کے لئے میں درسگاہ نہیں جاؤں گا بلکہ اَب مجھے سکول جانا ہوگا اِس لحاظ سے تو ایک گونہ خوشی ہوئی کہ "ست سبق"، اور "منزل"، پر طویل اور اُکتا دینے والی مغزماری سے جان چھوٹی لیکن ایک دفعہ میں ششدر ہو کر رہ گیا۔ مجھے یہ بالکل یاد نہیں کہ سکول تک مجھے کون لیکر گیا اور داخلہ کی رسم کس طرح ادا ہوئی۔ بہر حال اتنا یاد ہے کہ "اینگلوورنیکلر مڈل سکول للہ"، کی عمارت کے مغربی حصّہ (WING) کے انتہائی جنوبی کمرہ کے اندر میں "کچی پہلی" میں بیٹھ گیا۔

جب میں پہلی بار اِس ماحول سے متعارف ہوا تو میری حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ سکول اور مکتب کے درمیان کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ جماعت چند سخت بدتمیز لڑکوں پر مشتمل تھی جو میرے خیال کے مطابق احترامِ اُستاد کے تصوّر سے یکسر محروم و نا آشنا تھے۔ کمرہ کا ماحول غلیظ تھا۔ بیٹھنے کے لئے بچھا ہوا ٹاٹ بطور سیاہی چُوس استعمال میں لایا جا رہا تھا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بجائے "ا" آم "ب" بلی اور "پ" پہیلا کا سبق پڑھا تو اپنی قسمت پر بے اختیار رونا آیا اور بڑی مایوسی کے عالم میں سوچا کہ

Marfat.com

کہاں آ گئے ہم چمن سے نکل کے

ہمارے انچارج ٹیچر منشی محمد حسن صاحب البتہ نہایت پُرسکون اور باحوصلہ اُستاد ثابت ہوئے۔ میرے لئے غالباً اِن کے دِل میں والد محترم کی نسبت سے نرم گوشہ بھی تھا۔ یہ درست ہے کہ ابتدائی مراحل میں اگر ایسا حلیم الطبع اُستاد میسّر نہ آتا تو شائد اِس ماحول سے صُلح نہ ہو سکتی اور ایک نہ ایک دِن میں "یہ مجلس نامعقولاں کی لاحول ولا، لاحول ولا" کا نعرہ لگا کر وہاں سے بھاگ نکلتا۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت تھی کہ اِس ماحول سے 'صُلح' کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ آہستہ آہستہ لکھنے پڑھنے سے دلچسپی ہونے لگی۔ جب پہلی دفعہ میں نے اپنا نام لکھا تو بڑی خوشگوار حیرت ہوئی۔ میں نے والدِ محترم کو بھی اِس میں شامل کرنا چاہا تو انہوں نے خود اپنے دستِ مبارک سے تختی پر میرا نام لکھا اور اِس طرح میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

ہمارے ہیڈ ماسٹر راجہ محمد خان بڑی رُعب دار شخصیت کے مالک تھے۔ بشکلِ نوک اُوپر اُٹھی ہوئی مختصر مونچھیں اِن کے دبدبہ میں معتدبہ اضافہ کرتیں۔ وہ 'میانے کھوہ' سے نمودار ہو کر جب بڑ کے درخت کے قریب پہنچتے تو تمام لڑکے سکول کی عمارت کے پیچھے چُھپ کر دُبک جاتے اور شور تھم جاتا۔ وہ کم گو اور نظم وضبط کے بے حد پابند تھے۔ انگریزی لباس پہنتے۔ میں نے جب اُنہیں قریب سے دیکھا تو اِن کی 'شلوار' میری نگاہ میں بڑی کھٹکی۔ میں نے اپنی اِس حیرانی کا ذکر ماموں جان عبدالقدوس صاحب سے جو اتفاق سے تشریف لائے ہوئے تھے کیا کہ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کی شلوار ایک موٹے سے خوبصورت کپڑے کی ہے اور پھر پائنچے باہر کی طرف مُڑے ہوئے بھی ہیں۔ اُنہوں نے میری اِس نادانی پر بڑا ترس کھایا

Marfat.com

اور وضاحت کی کہ وہ شلوار نہیں بلکہ پتلون ہے۔ لفظ پتلون چونکہ ابھی تک میری لُغت میں شامل نہیں ہوا تھا۔ میں دَم بخود ہو کر دیر تک اِن کی طرف دیکھتا رہا۔

ہمارے کمرہ سے بالکل متصل پیپل کے بڑے درخت سے ایک چھوٹا سا گارڈر نما لوہا لٹکا ہوا تھا۔ جس سے گھنٹی کا کام لیا جاتا۔ گھنٹی مقررہ وقفوں کے بعد ایک دو تین کے حساب سے بجتی اور وقت گزرنے کا احساس دلاتی رہتی۔ چھٹی کی گھنٹی البتہ مسلسل بجتی اور ہم "جرس فریاد مے دارد کہ بر بندید محمل ہا" کا نعرہ لگاتے، بے ہنگم قسم کا شور مچا کر وہاں سے دَوڑ پڑتے۔

مڈل سکول کی یہ عمارت ایک معقول نقشہ پر اُٹھائی گئی تھی اور سکول کا چار دیواری سے محدود لیکن خاصا فراخ صحن چھوٹی چھوٹی خوبصورت کیاریوں پر مشتمل تھا۔ جن میں ملک فیروز خان صاحب جو ساتویں کلاس کے انچارج تھے۔ بڑی محنت سے پھول لگاتے اور اِن کی آبیاری کرتے۔ صحن کے اندر سلیقہ سے تیار کی ہوئی روشیں اِن کو ایک دوسرے سے جدا کرتیں۔ اِن روشوں پر لڑکے ڈرل، اور تفریح کے وقت بڑی پابندی سے قطار اندر قطار، اِدھر اُدھر چل کر جاتے۔ یہ سب ہیڈ ماسٹر صاحب (راجہ محمد خان) کا اعجاز تھا یہ کمال نظم و ضبط مجھے بعد میں کسی بھی تعلیمی ادارے میں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ بلکہ خود اسی اسکول میں راجہ صاحب کے تبدیل ہونے کے بعد اِن روشوں پر لڑکوں کے فضول اور بے معنی جمگھٹے شروع ہو گئے اور نظم و ضبط کی دلیل خوبصورت قطاریں آہستہ آہستہ عنقا ہوتی گئیں۔ ہمارا اسکول و تعریف، یعنی حمد باری تعالیٰ کے بعد شروع ہوتا۔ اُس حمد شریف کا ایک شعر مجھے اَب تک یاد ہے ؎

تُو شاہوں کو گدا کر دے گدا کو بادشاہ کر دے
اشارہ تیرا کافی ہے، گھٹانے میں بڑھانے میں

سکول کی واحد دُکان "مالک چند" کی لکڑی اور شیشے کی بنی ہوئی چھابڑی تھی جو وہ سکول کی چار دیواری کے باہر پیپل کے درخت کے نیچے لے کر بیٹھا رہتا۔ وہ ایک روایتی ہندو تھا۔ جس کے سر پہ "لٹ" دیکھ کر بڑی کراہت ہوتی۔ تاہم ہم اُس کے باقاعدہ گاہک تھے اور اس سے ریوڑیاں اور پیڑے خرید کر بزعم خویش عیاشی کی انتہا کر دیتے۔

قصّہ مختصر یہ کہ آہستہ آہستہ یہ ماحول رَاس آتا گیا اور مکتب کی اصطلاح میں میں "پکا سکولیا" بن گیا۔

منشی اللہ دین "حال" دوسری جماعت کے انچارج تھے۔ وہ کم گو اور سنجیدہ طبیعت کے مالک ہونے کی وجہ سے واقعی مرد "حال" تھے۔ "دو دُونے چار" سے لے کر "سولہا سولہیاں، دو سو چھپن" تک پہاڑے اُنہوں نے ایسے یاد کرائے کہ ابھی تک پوری طرح بھلائے نہیں جا سکے۔

اُن دنوں ٹیچر صاحبان اتنے گپ باز اور وقت ٹالنے والے نہیں ہوتے تھے۔ اِس کے باوجود والدِ محترم نے گھر پہ پرائیویٹ تعلیم کا خصوصی بندوبست فرمایا اور سکول ہی کے سٹاف کے ایک بزرگ رکن جناب منشی نورالدین صاحب مرحوم کو یہ فرض سونپ دیا۔ منشی صاحب کے طعام و قیام کی ذمہ داری خود قبول کی اور "برساتؔ" سے ملحق محمد چدھڑ کے گھر کے دروازے کے عین بالمقابل جس کمرہ کا دروازہ کھلتا تھا۔ اِس میں منشی جی قیام پذیر ہو گئے۔ مرحوم اپنی ملازمت کے آخری سالوں

Marfat.com

میں تھے اور دو اڑھائی سال بعد یہاں ہی سے ریٹائر ہو گئے۔ وہ محنتی ہونے کے علاوہ 'حق حلال' کی روزی میں ایمان رکھتے تھے۔ وہ پوری پابندی سے وقتِ مقررہ پر پڑھائی شروع کرتے اور پڑھائی کے لئے متعیّن اوقات سے پہلے کبھی فارغ نہ کرتے۔ ویسے تو قبلہ بھائی صاحب بزرگوار اور بعض اوقات بھائی عبدالرسول صاحب بھی اِن سے پڑھتے۔ لیکن محمد عباس مرحوم اِس پڑھائی میں میرا واحد ساتھی تھا۔ محمد عباس چوہدری فتح علی مرحوم کا بیٹا تھا اور بعد میں وہ تپِ دق کے مہلک مرض میں مبتلا ہو کر ۱۹۵۹ء میں فوت ہو گیا۔ وہ دلچسپ اور شریر طالب علم تھا اور منشی جی کی ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کا زیادہ نشانہ بنتا۔ اِس پرائیویٹ اور نجی تعلیم سے خود اعتمادی میں کافی اضافہ ہوا اور معیارِ قابلیت نسبتاً بہتر ہو گیا۔

جناب منشی نورالدین نہایت شریف النفس انسان تھے اور والدِ محترم کی دعوت پر ہمارے ہاں منتقل ہونے کے بعد بالکل یہاں ہی کے ہو کر رہ گئے۔ ہمارے دُکھ سے دُکھی اور سُکھ سے سُکھی۔

وہ حکمت سے بھی شغف رکھتے تھے اور بعض نہایت مفید اور جادو اثر نسخے بڑی کامیابی سے آزماتے۔ کرم دین موچی ولد تابو مرحوم "اندراتے"، کا مریض تھا۔ اور اِس نامراد مرض کے ہاتھوں بڑا پریشان وہ اُسے کوئی دوائی دیتے۔ جس سے اِس کی بینائی رات کے اوقات میں لوٹ آتی۔ محمد عباس مذکور ایک دفعہ آشوبِ چشم کی تکلیف سے کافی عرصہ تک دوچار رہا۔ جناب منشی جی نے جب اِس کی حالت بگڑتی دیکھی اور انگریزی دواؤں کے بے اثر اور فضول ہونے کا سب کو یقین ہو گیا تو اُس کے پاؤں کے انگوٹھا کے ناخن پر ایک پیلے رنگ کا محلول لگایا۔ جس سے اگلے

Marfat.com

روز اُس کی آنکھ صحت یاب اور سُرخی وغیرہ سے بالکل صاف ہو چُکی تھی۔ اِن کے ایک رفیق کار منشی عبدالغنی اُن سے معاصرانہ چشمک رکھتے اور اِن کے خلاف ایک محاذ سا بنائے رہتے۔ لیکن اُنہوں نے اِن کی ایسی ہلکی پھلکی، حرکات کا کبھی سنجیدگی سے نوٹس نہیں لیا۔ منشی عبدالغنی اُس زمانے کے اساتذہ میں غیر سنجیدہ اور اپنے پیشہ سے متعلق روایات کے خلاف باغیانہ سرگرمیوں کے لئے مشہور تھے۔ بعد میں اُن سے ایک افسوسناک واقعہ بھی منسوب ہوا۔ جس کے ساتھ ہی غالباً وہ یہاں سے تبدیل ہو کر چلے گئے۔

چوتھی جماعت کے چند لڑکوں نے وظیفہ کے امتحان کے لئے تیاری شروع کی تو منشی جی مرحوم نے میرا نام بھی تجویز کر دیا۔ امتحان کا مرکز پنڈ دادنخان تھا۔ جناب منشی جی میرے ہمراہ گئے۔ ایک بڑے ہال میں تحصیل کے سب اُمیدواروں کی استعداد کا جائزہ لیا گیا۔ باقی مضامین میں تو میری استعداد خاص نمایاں نہ تھی۔ البتہ یہ مسرّت مجھے آج تک یاد ہے کہ 'املا' میں مَیں سارے مرکز میں اوّل رہا۔ مجھے تو جو خوشی ہوئی سو ہوئی منشی جی اِس طرح خوشیاں بکھیر رہے تھے جس طرح گویا اِن کا اپنا بیٹا 'ولایت پاس' کر کے ابھی ابھی لوٹا ہو۔ سبحان اللہ اَب کہاں دُنیا میں ایسی ہستیاں ہیں۔

میں چوتھی جماعت سے ترقی یاب ہو کر مڈل کی جماعتوں میں آیا تو منشی جی مرحوم بھی ریٹائر ہو گئے۔ وہ جہلم سے متصل ڈومیلی کے مضافات کے رہنے والے تھے۔ ایک دو خط بھی موصول ہوئے لیکن افسوس کہ رابطہ کچھ قائم نہ رہ سکا اور اِس طرح میں ایک شفیق اور مخلص مربّی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔

Marfat.com

نہ شکستہ ام سبُورا

مکتب سے نکلنے کے بعد سکول کا ماحول اُب طبیعت میں بڑی حد تک رچ بس گیا تھا لیکن ع "من اگرچہ توبہ گفتم نہ شکستہ ام سبُورا" کے مصداق مکتب سے میرا تعلق بہر حال وبہر طور قائم رہا۔ اِسی عرصہ کے دوران اُستاد نواب صاحب کو حفظِ قرآن پاک کے ایک معتبر اور مستند اُستاد جناب اورنگ زیب صاحب اُنکی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر چُکے تھے۔ جناب اورنگ زیب صاحب کا بال بال "اُستادپن" میں گُندھا ہوا تھا اور وہ چوبیس گھنٹوں میں ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی اِس حیثیت سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ ہوتے۔ وہ رُعب دار شخصیت کے مالک تھے اور حد سے زیادہ سنجیدہ ہونے کے باعث طالب علموں کے لئے بے حد پُراسرار۔ اِن کی شبانہ روز محنت اور لگن سے درس شریف کا پرانا ماحول جو حافظ جی صاحب مغفور سے ہی مختص تھا پھر لوٹ آیا اور پھر وہی پرانی رونق اور بابرکت گہما گہمی شروع ہوگئی۔ میں بھی اَب بطور "ناظر خواں" درس میں شامل ہوگیا تھا اور سکول سے فارغ اوقات میں کچھ پڑھ لیتا۔ غلام مرتضےٰ از دیوی۔ عنایت شاہ از احمد آباد۔ حافظ افضل ولد حافظ جہانہ صاحب مرحوم اور حافظ عبید اللہ عرف بیدا ولد حافظ قائم دین صاحب (للہ شریف) اِسی دَور کے قابلِ ذکر طالب علم ہیں۔ ہفتہ کے اختتام پر یعنی جمعرات کی شام بعد از نمازِ عصر اُستاد صاحب

Marfat.com

ہر طالب علم سے "رکوع" سنتے جس سے مسابقت کا صحتمند جذبہ پیدا ہوتا۔

اُستاد اورنگ زیب صاحب پرانے خیالات کے مالک (ORTHODOX) اور راسخ العقیدہ (RIGID) مسلمان تھے۔ چنانچہ زیادہ کھیل کود کو بھی جائز نہیں سمجھتے تھے۔ مثلاً گیڈی کھیلنا تو کجا دیکھ لینا بھی اُن کے نزدیک "خلافِ شرع" حرکت تھی۔ ایک دفعہ ہم چند احباب "رمضان والے پڑ" پر "ملی کوڈی" دیکھنے چلے گئے۔ اِس بات کی بھنک کہیں اُستاد صاحب کے کان میں پڑگئی۔ ایک قاصد کے ذریعہ اُستاد صاحب کا پیغام جسقدر روح فرسا ہو سکتا تھا۔ اِس کا اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں۔ واپس پہنچے تو اُستاد صاحب کا موڈ بہت خراب دیکھا۔ اُنہوں نے حکم دیا کہ سب کان پکڑ لو۔ حکم کی تعمیل میں سب نے ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کی۔ اُستاد صاحب سزا یافتگان کی لمبی قطار سے مخاطب ہو کر سخت ناراض ہو رہے تھے کہ غلام مرتضیٰ جو اِس سارے ڈرامہ سے بے نیاز ہنسی ضبط کرنے کی مسلسل کوشش کر رہا تھا، کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ زور سے ہنس پڑا۔ اُستاد صاحب نے دل ہی دل میں اِس زندہ دلی کی داد تو ضرور دی ہو گی لیکن ڈسپلن کی اِس واضح خلاف ورزی کو نظر انداز کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ انہوں نے ایک اور طالب علم کو بلایا اور اِس کی پیٹھ پر بٹھا کر اسے سامانِ عبرت بنانے کی کوشش کی۔ لیکن افسوس کہ یہ سزا بھی غلام مرتضیٰ کا موڈ نہ بدل سکی ؎

تو آں قاتل کہ از بہر تماشا خونِ من ریزی
من آں بسمل کہ زیر خنجرِ خوں خوار مے رقصم

برادر بزرگوار نے ۱۹۴۱ء میں رمضان المبارک شروع ہونے سے چند روز قبل حفظِ قرآن پاک کی تکمیل کی اور جناب اُستاد صاحب کی "سماعت" میں نمازِ تراویح کے

Marfat.com

اندر قرآن شریف سُنانا شروع کیا۔ رمضان المبارک اُس زمانے میں ایسے مہمان کی طرح وارد نہیں ہوتا تھا۔ جس کو اندر سے تاڑ کر اکثر میزبان کہلوا بھیجتے ہیں کہ "ابھی ابھی اسپرو لے کر لیٹے ہیں"، بلکہ اِس مبارک مہینہ کی آمد اُس مہمان کی مانند متصوّر ہوتی جو چند لمحوں کے لئے قیام کرے اور میزبان پر نوازشات کی بارش برسا کر رخصت ہو جائے۔ نزولِ قرآن پاک کے اِس مہینہ کا انتظار بڑے شوق و ذوق سے کیا جاتا تھا۔ غلام محمد کفش دوز عرف کوڈی موچی جو نقارہ بجانے پر مامور تھا۔ بڑے اہتمام سے نقارہ بالکل نیا بنواتا اور اِس کی نوک پلک سنبھالنے سنوارنے کی فکر میں ہوتا۔ محلّے والے اپنی اپنی مسجدوں کے لئے حافظ صاحبان کی تلاش شروع کرتے تو دوسری طرف حفّاظ "نرخ بالا کُن کہ ارزانی ہنوز" کے موڈ میں ہوتے۔ حالانکہ معاوضہ وغیرہ طے کرنا یا اِس کی توقع رکھنا ایک گناہ سمجھا جاتا۔ صرف چچا جان کی حویلی ایک ایسی جگہ تھی جہاں حفّاظ قرآن مجید سُنانے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے کیونکہ چچا جان کی سماعت میں قرآن پاک سُنا لینا بذاتِ خود ایک بہت بڑی سند تھی۔ ایک رمضان شریف میں متعدد ختم صرف چچا جان کے ہاں ہی ہوتے اور پوری پوری رات ایک محفل کا سماں رہتا۔

والدِ محترم بنگلہ پر ہی نمازِ تراویح ادا فرماتے اور چند نہایت ہی متبرک صورتیں مخصوص وقت پر پہنچ جاتیں جن میں سے میاں زمان صاحب، میاں محمد صاحب اور صوبیدار لعل خان صاحب مرحوم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حافظ غلام محمد صاحب "پیر بھلاہی" اور حافظ محمد بخش صاحب "پھپھرا" اُس وقت بڑے "اجل" حافظ سمجھے جاتے تھے اور دونوں ہی والدِ محترم کے بہت پسندیدہ بھی تھے۔ حفظِ کلام پاک

ہیں اِن کی پختگی واقعی مثالی تھی۔ اِن کی تلاوت کا بھی مخصوص انداز تھا۔ بے حد سادہ مگر انتہائی دلآویز۔ زمانۂ ہوش کے ابتدائی دو ایک سالوں کو چھوڑ کر میری یادداشت کے مطابق اکثر حافظ محمد بخش صاحب ہی نمازِ تراویح کی امامت کرتے۔ والدِ محترم اِن کا خاص خیال رکھتے تو دوسری طرف حافظ صاحب بھی ایک روائتی عقیدتمند کی طرح نہایت مؤدب اور دست بستہ حاضر ہوتے۔ نمازِ عشاء اور وِتروں کی امامت بھی حافظ صاحب خود ہی کرتے جو والدِ محترم باقاعدہ اُٹھ کر بحالتِ قیام ادا کرتے ویسے نمازِ تراویح وہ کھڑے ہو کر ادا کرنے سے معذور تھے کیونکہ زیادہ دیر تک نہ اُن کے لئے کھڑا رہنا ممکن تھا اور نہ ہی دوزانو ہو کر بیٹھ رہنا۔ میں اکثر اِن کے پیچھے دوسری صف میں ہوتا اور اِن کی ہر ہر حرکت کو بڑے غور سے دیکھتا رہتا۔ وہ ناقابلِ بیان حد تک مسحور کُن شخصیت کے مالک تھے۔ جس محفل میں ہوتے اللہ کی رحمت گلاب کے پھول کی پنکھڑیوں کی طرح مسلسل برستی ہوئی محسوس ہوتی۔ مجھے اِس بات سے کوفت بھی ہوتی کہ وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھنے پر کیوں مجبور ہیں اِس ضمن میں ایک بڑی عجیب روائت قاضی محمد امین صاحب چکوڑہ نے سُنائی کہ سرہند شریف میں ایک مرتبہ حضرت مجدّد الف ثانی امام ربانیؒ کے عُرس مبارک کے موقع پر ختمِ خواجگان پڑھا جا رہا تھا۔ پورے غیر منقسم ہندوستان کے مشائخ عظام اور پیرانِ طریقت جمع تھے۔ خلیفہ صاحب خود صدرِ مجلس تھے۔ اِن شرکاء میں سے کچھ حضرات باقاعدہ دوزانو ہو کر نہیں بیٹھے تھے جو کہ خلافِ قاعدہ بات تھی۔ چنانچہ خلیفہ صاحب نے اشاروں سے انہیں دوزانو ہو کر بیٹھنے کا حُکم دیا اور سب لوگ تعمیلاً ٹھیک ہو کر بیٹھ گئے۔ والدِ محترم نے بھی جو گوٹھ، مار کر بیٹھے ہوتے تھے، دوزانو ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔ اِس پر خلیفہ صاحب نے اُنہیں اپنی پہلی حالت

Marfat.com

پر واپس آنے کا اشارہ کیا۔ لیکن والدِ محترم اس سے متردّد رہے اور خلیفہ صاحبؒ کے اصرار کے باوجود بدستور دوزانو ہی بیٹھے رہے۔ یہاں تک خلیفہ صاحبؒ نے ختم خواجگان روک دیا اور فرمایا کہ جب تک سجاد نشین اللہ شریف آلتی پالتی مار کر نہیں بیٹھیں گے ختم شریف شروع نہیں ہوگا۔

سرہند شریف کے ضمن میں ایک اور قیمتی روایت عمِّ محترم کی زبان سے سُننے کا اتفاق ہوا کہ ایک مرتبہ عُرس شریف کے موقع پر حضرت مُلّا شور بازارؒ جو کہ حضرت مجدّد الف ثانی امام ربّانیؒ کی اولاد میں سے تھے اور افغانستان کے واحد روحانی پیشوا تھے۔ عرس مبارک پر سرہند شریف تشریف لائے۔ حضرت مجدّد الف ثانی امام ربّانیؒ کی اپنی اولاد ہونے کے سبب وہ بے حد عزت و تکریم کے مستحق تھے۔ چنانچہ لاکھوں کا مجمع آپ کی زیارت کے لئے ٹوٹ پڑا۔ حضرت مُلّا شور بازارؒ جو انتہائی بے لوث اور بے نیاز شخصیت کے مالک تھے۔ کس کس کو خاطر میں لاتے۔ چنانچہ ان کا ایک نظر دیکھ لینا ہی بہت بڑی سعادت سمجھا جاتا۔ جب والدِ محترم بھی اس کوشش میں مصافحہ کے لئے آگے بڑھے تو حضرت مُلّا شور بازار اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور آگے بڑھ کر ان کو گلے لگا لیا اور ماتھے پر بوسہ بھی دیا۔ یہ منظر لوگوں کے لئے بہت ہی عجیب اور ناقابلِ فہم تھا۔ لیکن ؎

داغے کہ سوزد در سینۂ من
آں داغ کم سوخت در لالہ زاراں

Marfat.com

رتّہ شریف

عہدِ طفلی کا وہ زمانہ جب "تھے دیارِ نو زمین و آسماں میرے لئے" بہت ہی خوب تھا۔ بچپن کی وہ یادیں مجھے بڑی ہی عزیز ہیں جو ہمارے ننھیال کے گاؤں رتّہ شریف کی طرف سفر سے متعلق میرے ذہن کے ایک قدیم لیکن بے حد متبرک گوشہ میں محفوظ ہیں۔ والدہ محترمہ کے ہمراہ، ہم رتّہ شریف کے سفر پر روانہ ہوتے۔ اِس سفر کے لئے موسم مخصوص تھا اور یہ سفر صرف موسمِ گرما ہی میں اختیار کیا جاتا۔ لیکن 'کُنڈل' کے ایک صوفی شاعر میاں الٰہی بخشؒ کے بقول اِس شان کے ساتھ کہ ؎

ادھی راتیں کوچ جنہاندا پہلی رات تیاری

حقیقت یہ ہے کہ آخرِ شب کی وہ اُداس چاندنی میرے ذہن سے آج تک محو نہیں ہو سکی۔ رتّہ شریف سے زیادہ اُس کا راستہ ہمیں پُر رومان معلوم ہوتا۔ سردھی سے نلکوں کے ذریعہ محفوظ کئے جانے والے پانی کے ذخیرہ (RESERVOIR) المعروف "تالاب" سے ہماری "ملاقات"، صرف اسی سفر کے دوران ہوتی جو للہ سے کھارہ کی طرف صرف ڈیڑھ میل کے فاصلہ پہ واقع تھا۔ "گلیانی ٹوٹی" اور "ترکھانی ٹوٹی"۔ یہ بالکل عام قسم کے الفاظ ہمارے لئے بڑے بامعنی اور پُرکشش تھے۔ یہاں سے آگے آہستہ آہستہ کھارہ کے پہاڑوں کی ہیئت کذائی تبدیل ہونا شروع ہو جاتی اور "دُور درشن"

Marfat.com

سے جما ہوا حسین نقش (IMAGE) پاش پاش ہو کر رہ جاتا۔ پہاڑ کی خاصیت کا یہ پہلو شائد بستی کے عام باسیوں پر بھی صادق آتا ہو۔ بہر حال کھارہ کی وادی میں گم ہو کر جب ہم بستی کی تہہ کو پہنچ جاتے تو دوسری طرف سر دمی کی بلندی اور عظمت بھی ہمارے استقبال کے لئے بے تاب ہوتی۔ "پڑن سیال" سے کافی آگے اور کلر کہار سے کچھ پہلے ڈسٹرکٹ بورڈ کی پرانی سڑک کے کنارے ایک کہنہ اور عمر رسیدہ "منڈمنڈ" درخت سے ہماری بڑی آشنائی تھی۔ سارا سال دعا کرتے کہ ایک مرتبہ پھر اُسے دیکھ لیں اِس درخت سے اُنس اِس وجہ سے بھی تھا کہ انتہائی کمزور اور فلاکت زدہ ہونے کے علاوہ قدیم زمانہ کی کوئی نشانی معلوم ہوتی اور سرگوشیوں کی زبان میں شکوہ کناں کہ ؎

نہ گلم نہ برگ سبزم نہ نہالِ سایہ دارم

در حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

آگے بڑھ کر بلندی سے جب کلر کہار کے پُر بہار باغات اور خوشگوار سبزہ زار پر نظر پڑتی تو سُبحان اللہ ؎

تو گوئی کہ یزداں بہشتِ بریں را

نہاداست در دامنِ کوہسارے

یہاں سے آگے تو پھر "سیّونام محمّد والا لگدا بہت پیارانی" کی تکرار کرتے ہوئے رتہ شریف کی حدود میں داخل ہو جاتے۔ ایک موقع پر ان تاثرات کو میں نے اِس طرح بیان کیا تھا:

"رتہ شریف میل ڈیڑھ میل دُور سے ہی نظر آنے لگتا اور ہم اِس کی ایک جھلک دیکھتے ہی جنّتِ ارضی کے تصوّر میں گم ہو

Marfat.com

جاتے۔ خاص طور پر جب پرانی وضع کے لوگ استقبالاً آگے بڑھتے تو ہم اُنہیں آسمان سے اُتری ہوئی نہایت متبرّک مخلوق تصوّر کرتے۔ ایک شاعر کو ہماری کیفیت کا شائد علم ہوگیا۔

مکیں تھے یا کسی کھوئی ہوئی جنّت کی تصویریں
مکاں اِس شہر کے بھُولے ہوئے سپنے لگے ہم کو"

گھر میں داخل ہوتے تو ایک بڑا اور کشادہ صدر دروازہ عبور کرنا ہوتا۔ میں تو اُسے بار بار چھُو کر اپنی اُداسی ختم کرتا۔ اِس گھر کی ہر چیز کے لئے ہم بے حد اُداس ہوتے اور داخل ہو کر ملنے ملانے سے بے نیاز انہی کے نظارے میں گُم ہو جاتے۔ گھر کا صحن خاصا کشادہ تھا۔ اِس کو ایک نظر دیکھ کر ایک اطمینان سا ہوتا۔ "صفّہ" سے گذر کر پہلے نئے اور پھر پرانے "محل" میں داخل ہوتے۔ پرانا "محل" حضرت مفتی امام دین صاحب قدّس سرہٗ العزیز، والد ماجد حضرت مفتی عطا محمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے تعمیر کرایا تھا اور اِس کی بھینی بھینی مخصوص خوشبو ماضی کی دلفریب یادیں پھر سے تازہ کر دیتی اور ہمیں فیضان کی ایک خاص کیفیت سے مستفیض ہوتا۔ نانی جان ایک سایۂ رحمت تھے۔ لیکن "تائی صاحبہ" ہمیں دیکھ کر کسی خوشگوار ردِ عمل کا اظہار نہ کرتے اور موقع پا کر ہماری واپسی کی تاریخ کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے۔ مکان کی چھت پر فوراً چڑھ جاتے اور گرد و نواح سے اِس طرح اکتسابِ فیض کرتے کہ کوئی حسرت باقی نہ رہتی۔

شور و شر سے دُور، بہت دُور پُر سکون خاموشی میں ڈوبی ہوئی یہ چھوٹی سی بستی واقعتاً اثر انگیز ماحول پیش کرتی اور "لیلیٰ شب" کی "زلفِ رسا" کھل جانے کے بعد تو یہ

Marfat.com

ماحول پُر اسرار بھی ہو جاتا۔ دُور دُور تک پھیلی ہوئی پہاڑی چوٹیوں کی تنہائی سُبحان اللہ

وہ خموشی شام کی جس پر تکلّم ہو فِدا

وہ درختوں پر تفکّر کا سماں چھایا ہوا

اُس زمانہ میں مدرسہ شریف کا گھر مکمل طور پر آباد تھا اور یہ ویرانی جو آج اِس کے مقدر میں لکھی نظر آتی ہے اُس وقت اِس کا دُور دُور تک کوئی نشان دکھائی نہ دیتا۔ ہمارے ورود سے تو اِس کی رونقیں اپنے نکتۂ کمال تک پہنچ جاتیں۔

صحن میں علی الصبح چڑیوں کے چہچہانے بلکہ شور سے آنکھ کھُلتی۔ وہ صُفّہ کے پنجروں میں اِس طرح پھُدکتیں کہ اُٹھے بغیر کوئی چارہ نہ رہ جاتا۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (ناناجان) اپنی مصروفیات منسوخ کر کے زیادہ عرصہ ہمارے ساتھ گزارتے ساتھ ہی درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع رہتا۔ "شیخ عبداللہ" نامی ایک درویش کو درس دیتے ہوئے ناناجان بڑی خوبصورت لے میں فارسی کے اشعار پڑھتے اور ان کی تشریح فرماتے۔ یہ ماموں جان مفتی عبدالقدّوس صاحب ہاشمی کے شباب کے دن تھے۔ اُس زمانے میں وہ قابلِ رشک صحت کے مالک اور بڑے ہر دلعزیز لگتے اور بڑے "فیشن ایبل" اور "اَپ ٹُو ڈیٹ" نظر آتے۔ بڑے ماموں جان جناب عبدالرزاق عبرت البتہ "درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی" تھے اور "نکلے کبھی گھن سے آئے کبھی گھن میں" کی ایک رنگین صورت۔ نانی صاحبہ کے گرد گھر کا سارا ماحول گھومتا وہ بلا شرکت غیرے اپنے گھر پر بڑی مؤثر حکمرانی کرتے۔ رسوئی میں ہم ان کے پاس ہی بیٹھ جاتے اور اُس زمانے کے ٹفن کیریر یعنی "سرپوس" سے گرم گرم روٹیاں نکال کر کھانا شروع کر دیتے۔

یہاں ایک پُرمین چہرے والے بزرگ جناب فضل کریم صاحبؒ درسِ قرآنِ پاک کے اُستاذ تھے۔ یہ درس مسجد سے ملحقہ جنوبی طرف صرف ایک کمرہ پر مشتمل تھا۔ اُستاد صاحب موصوف ہمیں اپنے گھر کے اُستادوں کے مقابلہ میں فرشتۂ رحمت نظر آتے۔ وہ بڑے ہی باصفا اور حلیم الطبع بزرگ تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وقفہ وقفہ سے وہ اپنی "ڈھانگہ" نما سوٹی سے طالب علموں کو پڑھائی کی طرف متوجہ کرتے رہتے۔

قاری عبید اللہ صاحب (میرے خالہ زاد) سے پہلی مرتبہ میں یہاں ہی متعارف ہوا۔ یہ تعارف آہستہ آہستہ دوستی میں تبدیل ہوتا گیا۔ یہاںتک کہ رتہ شریف کے قیام کے دوران کوئی بھی پروگرام ان کے بغیر مکمل اور کامیاب نہ ہوتا۔ ان کا ایک بازو غالباً ٹائیفائیڈ کی وجہ سے فعال نہ رہا تھا۔ دوسری طرف میری زبان میں توتلاپن تھا اور میں حرف 'س' کو اِس طرح ادا کرتا کہ یہ 'ش' اور 'خ' کا دلچسپ ملغوبہ بن جاتا۔ ایک دن طے یہ پایا کہ اگر وہ میرے توتلاپن کو ٹھیک کر دیں تو میں ان کے بازو کا نقص دُور کر دوں گا۔ میں نے تو یہ نقص کیا دُور کرنا تھا البتہ قاری صاحب نے نہایت باریکی اور احتیاط سے مجھے "س" کا مخرج اِس طرح سمجھایا کہ میں اِس کی بالکل درست ادائیگی کے قابل ہو گیا۔

رتہ شریف میں مَیں جن حضرات سے متاثر ہوا کرتا تھا ان میں حضرت مفتی دین محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ آپ ناناجان کے بڑے بھائی تھے۔ اتنے پرہیزگار اور سادہ طبع بزرگ کہ ان کو ایک نظر دیکھ لینے سے قرونِ اولیٰ کے بزرگانِ دین کا تصوّر ذہن میں اُبھر آتا۔ تانی حضرت قدسؒ

Marfat.com

سرہٗ العزیز سے خلافت تھی۔ چہرے سے نور کی شعاعیں پھوٹتی رہتیں۔ بڑے پُر خلوص اور شفیق تھے۔ پابندیٔ شریعت کے معاملہ میں البتہ بے حد سخت گیر۔ ایک روایت کے مطابق والدِ محترم فرمایا کرتے کہ ریڈیو اس زمانہ کی ایک ضرورت ہے مگر حضرت مفتی صاحب موصوف کی زندگی میں یہ ضرورت پوری نہیں ہو سکتی۔

اُن کا اپنا درسِ قرآنِ پاک تھا۔ خاصی تعداد میں درویش حفظِ کلامِ پاک کے لئے اُن کے ہاں مقیم رہتے۔ عبید اللہ صاحب اور اُن کے برادرِ اصغر عنایت احمد صاحب نے اپنے دادا جان ہی سے حفظِ قرآنِ پاک کی نعمتِ لازوال حاصل کی۔ ان کی تلاوت بڑی پُرسوز اور وجد آور ہوتی۔ ایک مرتبہ ۴۴-۱۹۴۳ء میں آپ معراج شریف پر بلّہ شریف آئے۔ نمازِ ظہر کے بعد ختم شریف کا پروگرام رکوع خوانی سے شروع ہو چکا تھا۔ آپ بھی اس مجمع میں تشریف رکھتے تھے کہ اچانک والدِ محترم نے آپ سے رکوع پڑھنے کی فرمائش کر دی۔ وہ اُٹھے اور اسٹیج پر ہاتھ باندھ کر اور آنکھیں بند کر کے تلاوتِ کلامِ پاک شروع کر دی۔ سبحان اللہ! میں نے دیکھا کہ آہستہ آہستہ مجمع پر سکوتِ حیرت طاری ہوتا گیا اور لوگوں کی آنکھیں اِن کے شعاعیں چھوڑتے ہوئے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ خود والدِ محترم جو ہمیشہ "نہ دیکھا آنکھ اُٹھا کر جلوۂ دوست" کی ایک پُر وقار تفسیر رہتے نگاہ اُوپر اُٹھائے اُنہیں دیکھتے ہی چلے گئے۔ یہاں تک کہ نزولِ فیضان کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

۱۹۴۶ء میں اُن کی وفات ہوئی اور اِن کی مخصوص روایات و برکات بھی انہی کے ساتھ دفن ہو گئیں۔

حسنؔو فقیر کہا کرتا تھا

نکھی رُت گلاباں والی پُھٹے آن دھتورے

اور غالب نے کہا تھا ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تُو نے یہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے

ایک سُرخ و سپید معمّر بزرگ میاں رانجھن، بھی اسی دَور کی یادگار ہیں۔ وہ مسجد کے شمال میں حجروں کی نچلی منزل میں رہا کرتے۔ شگفتہ چہرہ اور قابلِ رشک صحت کے مالک تھے۔ اِن کے چہرے پر سفید چاکویں داڑھی بڑی بھلی معلوم ہوتی۔ حضرت مفتی صاحب (ناناجان) کے خادم بھی تھے وہ جب کبھی "پار" یعنی نہری علاقہ میں جانے کے لئے للّہ شریف سے گزرتے تو میں اُنہیں "سفیر پرتّ" سمجھ کر ان کی زیارت کرتا۔

خسّو فقیر جس کا اُوپر ذکر آچکا ہے یہاں کی ایک خاص رونق تھی۔ وہ ایک ایسی مختصر سی دُنیا تھی جو آپ ہی اپنی ولایت بھی تھی۔ ہر آدمی اس کے لئے 'بھنیا' (بھانجہ) اور ہر عورت اُس کے لئے 'بھنیٹی' (بھانجی) تھی اور اِس طرح وہ خود گویا ساری دُنیا کا 'ماما' تھا۔ پہلے پہل میں اِس کی اِس رشتہ داری سے بڑا متاثر ہوا لیکن ایک روز جب اُس نے میرے سامنے ایک معمّر عورت کو "بھنیٹے بھنیٹے" کہہ کر پکارا اور اُس خاتون نے کسی تعجّب کا اظہار کئے بغیر باتیں شروع کر دیں تو میرا سارا تاثر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

لوگ خسّو فقیر کو مکر و فریب کا شاہکار بھی تصوّر کرتے لیکن میرے خیال میں بات ایسی نہیں تھی۔ وہ اچھی خاصی جائیداد کا مالک تھا اور چک بھون گاؤں میں اُس کی

Marfat.com

برادری بھی تھی لیکن اچانک ایک ذہنی انقلاب سے اِس طرح دوچار ہوا کہ سب، کچھ اللہ کے نام پر وقف کر دیا۔ گویا اُس نے

"دُنیا نے ہمیں چھوڑا جذبیؔ ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دُنیا کو
دُنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں اَب دُنیا دُنیا کون کرے"

کا نعرۂ مستانہ لگایا اور حضرت مفتی دین محمد صاحبؒ کے دامنِ عافیت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خلوت گزیں ہو گیا۔

Marfat.com

درسِ نظامی

یہ ایک مہینہ ہمیشہ بڑی سرعت سے گزر جاتا اور میں اِن پیاری یادوں کو دل میں بسائے واپس اپنے گھر پہنچ جاتا۔ بڑی عجیب بات ہے کہ یہاں کا ماحول رتہ شریف کے مقابلہ میں خاصا بور معلوم ہوتا۔ نہ 'دھراب' نہ 'وڈھیہ'، نہ 'بدھی' نہ 'ہٹی'، حتّٰی کہ جمال دین صاحب کا وہ قدآور اور صحتمند کُتّا المعروف 'شوکی' بھی نظر نہ آتا جسے بعد میں انہوں نے غالباً بھیڑوں اور بکریوں پر 'دست درازی' کی پاداش میں ایک بلند چوٹی سے جو ان کے دھراب میں واقع 'جندر' سے مغرب کی سمت واقع تھی نیچے پھینک کر ہلاک کر دیا تھا اور جس کی دلدوز چیخ کا ذکر عنایت احمد صاحب آج بھی افسوس کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔

۱۹۴۲ء/۱۹۴۳ء کے لگ بھگ والدِ محترم نے مسجد خانقاہ شریف کے مینار اور مسجد کے سامنے والے حصّہ پر نقش و نگار بنوانا شروع کئے۔ اس سے پیشتر مسجد کے مینار اور اس کی چھت برابر تھے گویا مینار بالکل ندارد۔ مستری صاحبان خاصے کاریگر اور نیک نیّت لوگ تھے۔ والدِ محترم کام کی خود نگرانی فرماتے۔ اسی زمانہ میں جناب برادر بزرگوار نے قرآنِ پاک ختم کر لیا تھا۔ چنانچہ والدِ محترم نے اِن کے سلسلۂ تعلیم کو جاری رکھنے کی غرض سے درسِ نظامی کا یہاں بندوبست فرمایا اور

Marfat.com

مولینا رشید احمد چھنی گہنہ ضلع گجرات کو بطور مدرسِ اعلیٰ یہاں مدعو کرکے یہ خدمت ان کے سپرد کردی۔ مولینا رشید احمد ایک قابلِ قدر اور بزرگ اُستاد تھے۔ جناب استاد صاحب مرحوم کی آمد ایسے تھی گویا ؏

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا

اُب مسجد خانقاہ شریف میں گہما گہمی کا یہ حال تھا کہ ایک میلہ کا سماں رہتا۔ مدرسۂ حفظِ قرآن پاک اُب مدرسۂ درسِ نظامی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اُستاد صاحب کے جلو میں درسِ نظامی کے طالب علموں کا ایک گروہ بھی یہاں پہنچ چکا تھا۔ اُنہوں نے عربی و فارسی کُتب "ٹھوک بجا" کر پڑھی تھیں اور پڑھانے کا فن بھی خوب جانتے تھے۔ دہلی کے مدرسۂ امینیہ کے فارغ التحصیل تھے اور 'چھنی گہنہ' جیسے دورافتادہ دیہات سے تعلّق کے باوجود نہایت نفیس ذوق اور نستعلیق شخصیت کے مالک تھے۔ 'کریما' سے لے کر دَورۂ حدیث تک خود پڑھاتے۔ میں نے فارسی کی ابتدا شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے اِسی 'کریما' سے کی اور زانوئے تلمّذ انہی کے سامنے تہہ کیا۔ اُستاد صاحب "در مذمتِ بخیل" کے عنوان کے تحت جب اِس شعر پر پہنچے:

'گر در کفش گنجِ قارون بود
وگر تا یعش ربعِ مسکون بود'

تو ربعِ مسکون کی تفسیر ایک گول دائرہ بنا کر کی۔ جس میں چار خانے بنائے اور ایک خانہ روشنائی سے رنگین کر دیا۔ فرمایا یہ وہ حصّہ ہے جہاں انسان آباد ہیں اور باقی تین حصّے پانی پر مشتمل ہیں۔ میرے نزدیک دُنیا چونکہ صرف خشکی کا نام تھا لہٰذا بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کمیاب جنس درحقیقت اتنی فراواں ہے۔

مولینا بڑے سلجھے ہوئے اور دھیمے مزاج کے بزرگ تھے۔ والدِ محترم نے جنوبی قبرستان سے ملحق خالی جگہ پر ان کے لئے دو کمروں پر مشتمل ایک رہائش گاہ تعمیر کروائی جن میں سے مغربی کمرہ آج تک بفضلِ اللہ تعالیٰ اپنی اصلی حالت پر موجود ہے۔ درسِ نظامی کے طلباء خاصے خوش فکرے لوگ نظر آتے اور گاؤں سے باہر الگ تھلگ ماحول میں اپنی دُنیا آباد کئے رہتے۔ مولوی سیف الدین صاحب سالمی، مولوی محمد یونس، محمد صدیق، محمد شفیع، مولوی محمد اسمٰعیل ازبکنّ اور "گہنا" "زعمائے طلباء" میں سے تھے۔ اِن لوگوں نے مسجد کے ماحول کو ایسی رونق اور زندگی دی کہ پھر اِس کے بعد وہ رونق دیکھنے میں نہ آئی۔

والدِ محترم اِس پروگرام سے بڑی دلچسپی رکھتے۔ اکثر مولینا رشید احمد صاحب سے درس سے متعلق مسائل پر گفتگو فرماتے اور اِسے خوب سے خوب تر بنانے سے متعلق باتیں ہوتی رہتیں۔ اس درسِ نظامی کی ابتدا نے فی الواقع سارا ماحول تبدیل کر کے رکھ دیا۔ مولینا بعد از نمازِ مغرب گاؤں آجاتے اور والدِ محترم کے سامنے اُوپر چھت پر دیگر شاملین کے ساتھ دیر تک مراقبہ میں رہتے۔ دراصل مولینا اسباقِ تصوّف ہی کے ضمن میں یہاں منتقل ہونے پر آمادہ ہوئے تھے۔ یہ مراقبہ ویسے تو بعد از نمازِ فجر ایک معمول تھا اور والدِ محترم کی موجودگی میں اس کے ساقط ہونے کا کوئی موقع مجھے یاد نہیں۔ تاہم نمازِ مغرب کے بعد مراقبہ کا یہ نیا معمول، ایک طرف والدِ محترم کے دل میں مولینا کے لئے نرم گوشہ کا غمّاز تھا تو دوسری طرف مولینا کے دل میں عرفان و معرفت کا جو ذوقِ سلیم تھا اُس کا آئینہ دار۔ یہ شائد اِس لئے کہ مولینا ظاہری علم کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اپنے باطن کو منوّر کرنا بھی ضروری سمجھتے تھے۔

Marfat.com

اگر ز آتشِ خود شرارے بگیری
تواں کرد زیرِ فلک آفتابی
حیات است در آتشِ خود تپیدن
خوش آں دم کہ ایں نکتہ را باز یابی

اِس مراقبہ کا کیف و سرور تو اُن لوگوں کو علم ہوگا جو اِس سے فیضیاب ہوتے تھے مجھے البتہ وہ نعتیں بڑی بھلی معلوم ہوتیں جو محمد شفیع اور محمد صدیق مل کر پڑھتے پھپھروں کے کوٹھا سے ملحقہ چھت پر والدِ محترم جنوب مشرقی کونہ میں ایک نیم دراز کرسی پر تشریف فرما ہوتے۔ سامنے دری پر مولینا اپنے ساتھیوں سمیت 'توجہ' کی حالت میں بیٹھ جاتے۔ ان پُرسوز اور وجد آور نعتوں میں سے اکثر مجھے اَب تک یاد ہیں۔

قدموں میں مصطفٰےؐ کے میرا مزار ہوتا
وہ خاکِ پاک ہوتی یہ خاکسار ہوتا

جہاں روشن است از جمالِ محمدؐ
دلم زندہ شد از وصالِ محمدؐ
خوشا مسجد و منبر و خانقاہے
کہ در وے بود قیل و قالِ محمدؐ
بصدق و صفا گشتہ بے چارہ جامی
غلامِ غلامانِ آلِ محمدؐ

Marfat.com

مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی
دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی
شبِ معراج عروج تو زِ افلاک گزشت
بہ مقامے کہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبی
نسبتِ خود لبسگت کردم و بسے منفعلم
زانکہ نسبت بہ سگِ کوئے تو شد بے ادبی

اِس طرح کی پرانی اور برگزیدہ شخصیتوں کی سوزِ عشق میں ڈوبی ہوئی نعتیں ایسی مجلس میں عجیب سماں پیدا کر دیتیں۔ حافظ شیرازی کی یہ غزل بھی باقاعدہ نعتوں میں شامل تھی اور دونوں نعت خواں اسے بھی بڑے ذوق و شوق سے جھوم جھوم کر پڑھتے۔

بفراغِ دل زمانے نظرے بہ ماہ روئے
بہ از اں کہ چترِ شاہی ہمہ روز ہائے وہوئے
بخدا کہ رشکم آید بدو چشمِ روشنِ خود
کہ نظر دریغ باشد بہ چنیں لطیف روئے
نفسم بآخر آمد نظرم ندیدہ سیرت
بخریں نماند مارا ہوسے و آرزوئے

نعتوں کا یہ سلسلہ اتنا پرفیض تھا کہ پوری فضا رحمتوں اور برکتوں سے معمور رہتی۔ یُوں تو یہ سلسلہ بہت قدیم تھا اور اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ العزیز کے مبارک دور میں نعت خواں موجود رہتے۔ چنانچہ چوہدری احمد خان صاحب کے والد بزرگوار

Marfat.com

ایک خوش الحان نعت خواں تھے لیکن اُس دَور کے حمد و ثنا پڑھنے والے لوگوں کے نام کہیں محفوظ نہیں۔ البتہ رمضان چدھڑ درویش اور ”لونی“ از نورخانیوالہ کے نام ہم نے ضرور سنے جو اس صنف کے ناموروں میں شمار کئے جاتے۔ لیکن یہ میرے ہوش سے کافی پہلے کی بات ہے۔ مولوی شاہ محمد صاحب از سرلہ (گجرات) والدِ محترم کے مقربِ خاص تھے۔ ان کی سُرخ رنگ کی رومی ٹوپی اور اس کا پھندنا خواب کے تصوّر کی طرح میرے ذہن میں ایک ہیولا سا بناتے ہیں ساتھ ہی ان کی متشرع ریش کا تصوّر بھی اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔

”ہے شان جو احمدؐ پیارے دا
نہیں شان اوہ عالم سارے دا“

اُن کی مترنّم آواز میں سُنا تھا کتنی عالمگیر حقیقت وہ کس سادگی اور پُرسوز ترنّم سے ادا کر دیتے۔ سبحان اللہ! شاہ محمد صاحب متقدّمین کی نشانی تھے اور نعت خوانی میں وہ اپنے دَور کے یکتائے روزگار۔ حافظ قائم الدین کی نعت میں نے البتہ خوب سُنی۔ حافظ صاحب بھی اپنے زمانہ کے ایک بے مثل نعت خوان سمجھے جاتے۔

صبح کی نماز والدِ محترم خود پڑھاتے۔ صبح کی قرأت خاصی طویل ہوتی۔ پڑھنے کا انداز سادہ مگر بے حد دلکش و دلنشیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کتنے خوش نصیب تھے وہ لوگ جنہیں ان کی اقتدا میں نماز پڑھنے کا شرف نصیب ہوا۔ سلام پھیرنے کے بعد سب لوگ بالکل خاموشی سے تسبیح پڑھتے ذکرِ جہر قسم کی کوئی چیز اُس وقت مروّج نہ تھی۔ جب دُعا کے لئے والدِ محترم ہاتھ اُٹھاتے تو سب لوگ مکمل سکوت کے ساتھ ان کی پیروی کرتے اور اِسی طرح کامل سکوت ہی کے عالم میں اُٹھ کر

Marfat.com

رخصت ہو جاتے۔ البتہ چوہدری محمد حیات صاحب کا کھنکورا بعض اوقات فضا میں ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا کر دیتا۔ یہ تھی اصل نقشبندیت جس کا اب خود نقشبندیوں میں نام ونشان باقی نہیں رہا۔

اُفتاد بدامِ خویش نشناخت مقامِ خویش

عشقے کہ نمودے خواست از نعرۂ یارب ہا

اِس کے بعد ختمِ خواجگان میں شامل ہونے والے حضرات ایک مستطیل نما گول دائرہ بناتے اور ایک گہرے رنگ کی سبز چادر ایک سرے سے دوسرے سرے تک بچھ جاتی۔ بدر دین درویش (سگھر) ایک گٹھی سے گوٹیاں اس چادر پر اُلٹ دیتے اور دُعائے خیر کے بعد ختم شریف شروع ہو جاتا۔ اس کی سربراہی شروع شروع میں بدر دین مرحوم اور مستری فتح محمد صاحبؒ از جہلوال ہی کے سپرد تھی لیکن ان کی وفات پر صوفی صدر دین صاحب کفش دوز اور حاجی محمد مرزا صاحب درویش از جنڈراں نے یہ ذمہ داری سنبھال لی۔ ختم شریف میں نظم وضبط کا زبردست اہتمام ہوتا۔ شرکاء دوزانو بیٹھتے اور کیفیت یہ کہ آنکھیں بھی اپنی گوٹیوں پر مرکوز رکھتے۔ ختم شریف کے اختتام پر مراقبہ شروع ہوتا تو گویا حافظ قائم الدین صاحب بھی میدان میں نکل آتے۔ فارسی نعتوں کے علاوہ اُردو اور بعض پنجابی نعتوں کا پُرسوز ترنّم حافظ جی ہی کا حصّہ تھا۔ ان کی آواز باریک اور سُریلی تھی اور ایسی پاکیزہ روحانی محفل میں اس کا جادو بڑا موثر ہوتا۔

عرش است کمیں پایہ زایوانِ محمدؐ

جبریلِ امیں خادمِ دربانِ محمدؐ

Marfat.com

یک جاں چہ کند سعدیٔ مسکیں کہ دو صد جاں
سازیم فدائے سگِ دربانِ محمدؐ

جب نورِ نبیؐ عرش کے ایوانوں پہ چمکا
کرسی نے لیا چوم غبار اُس کے قدم کا

حافظ صاحب "ایوانوں پہ چمکا" کو "ایوانیہ چمکا" پڑھتے اور اس طرح دل لگی کا سامان بھی ہو جاتا۔

۱۹۴۵ء میں شب برات کے موقع پر رات کو مسجد خانقاہ شریف کے صحن میں رات گئے حافظ جی نے حضرت پیر قصوری دائم الحضوری قدس سرہٗ العزیز کی یہ نعت پڑھی

فلک پر شور تھا ہر جا رسول اللہؐ آتے ہیں
ہر اک عرشیں یہ کہتا تھا رسول اللہؐ آتے ہیں
شفاعت کی اجازت لے کے جب آئینگے محشر میں
گناہگاروں کا غل ہوگا رسول اللہؐ آتے ہیں

شب برات کی فیوضات سے نئی نئی آشنائی تھی اور یہ غالباً پہلا موقع تھا کہ اُستاد صاحب مولینا صاحب از موضع "ودھن" (تحصیل بھلوال) کی تلقین و وعظ سے آتش بازی سے تائب ہوا تھا۔ یہ نوافل کی محفل تھی چاند کی پُر نور کرنیں مزار مبارک کی کوٹھڑیوں سے نیچے اُتر کر مسجد کے صحن کو تابندہ کر رہی تھیں۔ رات ڈھل چکی تو چند احباب نوافل کے درمیان سستانے کی غرض سے تھوڑی دیر کے لئے بصورت دائرہ

Marfat.com

ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ نعت شریف کے پُرسوز اور روح پرور ترنّم نے اِس مختصر سی مجلس کو سحر زدہ کر دیا اور یہ کیفیت میرے ذہن کو آج بھی بدستور متاثر کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

ہاں تو ذکر تھا مولینا رشید احمد صاحب کے اُس دَور کا جب مسجد خانقاہ شریف میں ہر طرف رونقیں تھیں اور طلبائے درسِ نظامی فارغ اوقات میں: ع

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن

کا نمونہ پیش کرتے۔ مولینا ایک اچھے مقرر بھی تھے اور حضرت مفتی صاحب (رحۃ شریف) سے تلمّذ کی بناء پر مثنوی مولینائے رومؒ کے اشعار سے اپنے مقالات کو مزید دلنشین بنا دیتے۔ مولینا مثنوی کے اشعار کو حضرت مفتی صاحب کے تتبّع میں اسی لے سے پڑھتے جو اُن کے اُستاد مکرمؒ کا انداز تھا اور اِس طرح کی یہ کامل تقلید صرف مولینا ہی کے حصّہ میں آئی۔ مولوی محمد اسمٰعیل درویش ازبکن کے نزدیک یہ تقلید مستحسن نہ تھی لیکن حقیقت یہ ہے مولینا کو حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمتہ سے جو والہانہ عقیدت تھی یہ اس کا ایک فطری تقاضا تھا: ع

عاشقاں بندۂ حال اند چناں نیز کنند

حضرت مفتی صاحب اپنی مسحور کُن شخصیت کے تناظر میں جب علم کے بحرِ ذخّار سے نایاب موتیوں کی لڑیاں نکال نکال کر لاتے تو مولینا سر جھکائے مسلسل روتے رہتے اور دل وجان سے قربان ہوتے رہتے۔

سبحان اللہ! ایک زمانہ تھا جب حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمتہ کے بغیر کسی بھی محفل، کسی بھی تقریب بالخصوص معراج شریف کی مبارک تقریب کا تصوّر بھی قریب

Marfat.com

قریب ناممکن تھا آپ ایسی محفلوں کے روحِ رواں ہونے اور عقیدتمندوں کے جھرمٹ میں علم و عرفان کے نور کی شعاعیں بکھیرتے چلے جاتے۔ افسوس کہ اِس قلیل عرصہ کے دوران میں ایسی تبدیلی رونما ہوئی کہ دیکھتے ہی دیکھتے ان اثر انگیز و عصر آفریں شخصیتوں کا نام تک لینے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ ع

وہ لوگ کیا ہوئے وہ زمانہ کدھر گیا

یہ ۱۹۴۰ء، ۱۹۴۱ء کی بات ہے میں عرس شریف کے اجتماعات میں نعت خوانی اور تقریروں کا بڑی بے تابی سے انتظار کرتا مسجد میں سائبان کا تننا دل کو بے پناہ مسرتوں سے بھر دیتا اور ایسے ماحول میں جو صرف عرس یا معراج شریف ہی کے موقع کا مرہونِ منت ہوتا۔ ہر طرف چہل پہل سے موڈ بڑا خوشگوار ہو جاتا۔ مولینا امیرالدین صاحبؒ گولپوری کی ہمرکابی میں آنے والے حافظ محمد صدیق نابینا کی نعت میں بڑے ہی شوق سے سُنتا۔ واعظین کی اکثریت میرے نزدیک تضیع اوقات کا موجب ہوتی جس سے میں سخت بور ہوتا۔ اِس میں حضرت مفتی صاحبؒ البتہ استثناء کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی باوقار اور پُریمن شخصیت کا بڑا اچھا اثر قبول کرتا۔ وہ جب بھی بحیثیت مقرر اسٹیج پر تشریف لاتے کیف و وجدان کی بارش برسا دیتے۔ میں معمولاً یہ منظر شیش محل کے اندر سے والدِ محترم کی نشست گاہ والی باری سے دیکھتا۔ زندگی میں پہلا فارسی کا شعر میں نے ایسی ہی کسی تقریر میں حضرت مفتی صاحب کی زبان سے سُنا اور پھر وہ آج تک ایسے ہی تازہ ہے جیسا کہ پہلے دن تھا

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما

دے طبیب جملہ عِلّت ہائے ما

Marfat.com

کمالِ علم و فضل کے باوصف آپ بڑے پُربہار انسان تھے۔ تقریر کے دوران میں حاضرینِ مجلس اچانک ہنس پڑتے تو علم کی سنجیدہ گفتاری، کا ماحول وقتی طور پر کافور ہو جاتا۔

معراج شریف اور عرسوں کے اجتماعات جب آہستہ آہستہ اپنی جسامت بڑھانا شروع کرتے تو پُرانی مانوس و آشنا بزرگ صورتوں کا وُرود بڑا دلفریب ہوتا۔

ایک مرتبہ سردیوں میں غالباً اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ العزیز کے عرس مبارک کا موقع تھا۔ والدِ محترم ناشتہ سے فارغ ہو کر شیش محل کی شرقی دیوار کے ساتھ بڑے کاؤچ پر تشریف فرما تھے۔ میں نے جب مہمانوں کو ڈیوڑھی کے صدر دروازہ سے گروہ در گروہ اندر داخل ہوتے دیکھا تو طبیعت مچل گئی اور فیصلہ کر لیا کہ آج سکول نہیں جاؤں گا۔ آہستہ سے شیش محل میں داخل ہوا اور خاموشی سے پلنگ کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ مہمانوں کی آمد جاری تھی۔ سب لوگ ذوقِ دیدار سے سرمست و سرشار داخل ہوتے اور روایتی طریق سے جھک کر سلام پیش کرتے اور خاموشی سے ہٹ کر دوزانو بیٹھ جاتے۔ متبرک نشست گاہ تقریباً بھر چکی تھی کہ اتنے میں انتہائی سادہ اور کھدّر میں ملبوس فقیر کرم دین پھیرہ (پیر پھیلاہی) بھی "سبحان اللہ، سبحان اللہ" کی گردان کرتے ہوئے مع ایک عدد ڈانگ داخل ہو پڑا۔ ڈانگ تو خیر فقیر صاحب نے دروازہ کے ساتھ لگا کر رکھ دی لیکن خود اسی عالمِ بے خودی میں شیش محل میں داخل ہو کر والدِ محترم تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ فقیر صاحب موصوف سے ابھی لوگ زیادہ آشنا نہیں تھے۔ ان کی سبحان اللہ سبحان اللہ کی بے تکلّف گردان لباس کی بے انتہا سادگی جس کی صفائی نہ ہونے کے برابر تھی، سے حاضرینِ

Marfat.com

مجلس چونک سے پڑے اور اِس جسارت پر حیرت و استعجاب کے جذبات اِن کے چہرے پر اُبھر آئے۔ فقیر صاحب جب والدِ محترم کے قدموں کی طرف جُھکے تو انہوں نے ہاتھ آگے بڑھا کر اُنہیں اُوپر اُٹھالیا اور دیر تک گلے سے لگائے رکھا بڑے بڑے صاحبِ حیثیت لوگ معطّر لباسوں میں ملبوس دور بیٹھے اِس خلافِ توقع منظر میں جذب ہو کر رہ گئے۔

به متاعِ خود چه نازی که به شہرِ دردمنداں
دلِ غزنوی نه نیرزد به تبسّمِ ایازے

شیش محل

شیش محل ایک رنگین، منقش اور فیضان و برکت سے بھرپور نشست گاہ تھی جسے ثانی حضرت قدس سرہُ العزیز نے تعمیر کروایا۔ یہ ایک "ہال" تھا جس کی دیواروں پہ بڑے خوبصورت نقش و نگار مستری حبیب صاحب مغفور نے ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۷ء کے لگ بھگ بنائے تھے۔ دیواروں پر بڑے موزوں اشعار لکھے ہوئے تھے مثلاً ۔

یارب تو کریمی و رسولؐ تو کریم

صد شکر کہ ہستیم میانِ دو کریم

چھت کی نقوش سے بھرپور سُرخ تختہ بندی ایسی تھی کہ فن کار کی مہارت ہر آنے والے سے خراجِ تحسین وصول کرتی۔ چھت میں گول آئینے اس تزئین و آرائش کے ساتھ جڑے ہوئے تھے کہ یہ ساری عمارت مغلیہ دَور کی کوئی نہایت پُر تکلف یادگار معلوم ہوتی۔ فرش پر مختلف قالین بچھے تھے دو باریاں مسجد کی طرف کُھلتی تھیں۔ والدِ محترم مشرقی باری کے ساتھ قالین پر گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھتے۔

حافظ محمد قاسم از جیتھل کی روایت کے مطابق حضرت قلندر رحمۃ اللہ علیہ از چاچڑ شریف (تحصیل شاہ پور) جو ثالث حضرت کے "پگ بھائی" تھے، نے اسی شیش محل میں باقاعدہ سازندوں کی موسیقی پر قوالی سُنی۔ حضرت قلندرؒ حضرت ثالث

سے خصوصی تعلق کی بناء پر والدِ محترم سے بے حد پیار کرتے۔ والدِ محترم تو اس قوالی کے دوران میں احتراماً بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ البتہ خلفاء اور دیگر مریدین نے اس خلافِ معمول "محفلِ موسیقی" پر سخت صدائے احتجاج بلند کی۔ بقول حافظ صاحب موصوف میری عمر اُس وقت تقریباً چار سال تھی اور میں اس محفلِ موسیقی میں خوب اچھلتا کودتا رہا اور اس طرح گویا قوالوں کے فن کی 'داد' دیتا رہا۔ مجھے حضرت قلندر نے گود میں اُٹھا لیا اور پیار کیا۔ لیکن اکابر مریدین کا اس "چشتیانہ جسارت" پر احتجاج زور پکڑتا گیا کہ نقشبندیوں کے اس متبرک مقام پر یہ طوفانِ بدعت، والدِ محترم تو بالکل خاموش تھے۔ حضرت قلندرؒ نے جب دیکھا کہ سجادہ نشین صاحب کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے تو بڑے وقار سے معترضین سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ بزرگو ناراض کیوں ہوتے ہو۔ "اگر ایک کتا مسجد کے صحن میں ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف سے نکل جائے تو کیا اس سے مسجد پلید ہو جائیگی؟" بقول حافظ صاحب اس "عارفانہ انکسار" پر لوگ زار و قطار رو پڑے اور اور یہ موضوع ختم ہو گیا۔

حضرت قلندرؒ حضرت شمس العارفین سیال شریف' کے خلفائے مجاز میں سے تھے۔ ثالث حضرت قدس سرہ العزیز سے خصوصی تعلق کی بناء پر والدِ محترم کی شادی پر اُنہیں دعوت نامہ بھیجا گیا تو اپنے لاؤ لشکر سمیت تشریف لائے۔ گاؤں سے باہر پڑاؤ ڈالا۔ تمبو قناتیں وہ اپنے ساتھ لائے تھے اُنہیں شہر میں آنے کے لئے جب درخواست کی گئی تو فرمایا کہ دعوت نامہ صرف میرے لئے تھا میرے 'لشکر' کے لئے نہیں لہٰذا میں خود کفیل ہو کر آیا ہوں اِن کے ہمراہ 'قوالوں' کی جماعت بھی تھی۔ اُنہیں عرض کیا گیا کہ قوالی یہاں نہ کرائیں تو ناراض ہوئے اور اس موقع پر اپنے انداز میں ہر قسم کے شادیانے بجانے پر اصرار فرمایا اس لئے کہ یہ ان کے یتیم بھتیجا کی شادی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میں بزرگوں کے احترام

کی وجہ سے باز رہا ورنہ میں تو کنجریاں نچانے کا پروگرام رکھتا تھا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

کچھ عرصہ بعد مولینا رشید احمد اچانک رخصت ہوئے تو مدرسہ کی زندگی بالکل بے کیف ہو کر رہ گئی۔ گویا۔ ع

اِک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

لیکن اعلیٰ حضرت قدّس سرہٗ العزیز کی اس کشادہ اور پُر سکون مسجد کا زیادہ عرصہ کے لئے بے رونق ہونا بھی غیر ممکن سی بات تھی۔ چنانچہ قدرت نے ایک ایسے نیک سیرت سراپا مروّت اور درویش صفت انسان کو اِس منصب کیلئے منتخب فرمایا کہ خدمت وایثار کے پچھلے تمام ریکارڈ مات ہو گئے۔ جناب صوفی احمد خان صاحب جن کا تعلق بھیرہ کے نواحی گاؤں "کوہلی" سے ہے بھلوال ہائی سکول سے نہایت امتیازی شان کے ساتھ میٹرک پاس کر کے چند احباب کے ساتھ والد محترم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ملاقات کے دوران غالباً والدِ محترم نے انہیں دینی تعلیم کے حصول کی تلقین فرمائی اور اِس کے ساتھ میری یعنی راقم الحروف کی انگریزی تعلیم میں رہنمائی کے لئے کہا۔ صوفی صاحب ذہین و فطین نوجوان تھے اور مستقبل کے اُفق پر اپنے شاندار کیریئر کو بڑی شفّاف صورت میں دیکھ رہے تھے لیکن اِس فرمائش پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔

ہمہ سرمایۂ خود را بہ نگاہے بد ہند
ایں چہ قومیست کہ سودا بزیاں نیز کنند

Marfat.com

لطفِ دُعائے سحر گیا

جناب صوفی صاحب موصوف کی اس مدرسہ میں آمد دراصل موجودہ دور کا ایک اہم واقعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ صوفی صاحب نے ابتدا ایک طالب علم کی حیثیت سے کی اور مولینا شبیر الرحمٰن صاحبؒ اور مولینا حکمت شاہ صاحبؒ سے جو مولینا رشید احمد صاحب کے فوراً بعد آئے تھے۔ کچھ تلمذ بھی کیا۔ لیکن اپنی حیرت انگیز استعداد کی بدولت وہ بہت جلد خود معلّم بن گئے اور معلّم بھی اس شان کے ساتھ کہ انہوں نے خانقاہ شریف پر درسِ نظامی کے اُستاد کی حیثیت سے غالباً طویل ترین عرصہ گزارا۔

پانچویں جماعت سے مڈل کلاسوں کا آغاز ہوا تو یہ ماحول نسبتاً بہتر محسوس ہونے لگا۔ یہ سکول کی عمارت کے انتہائی مشرقی حصّہ کا آخری جنوبی کمرہ تھا۔ تعجّب ہوا کہ اس میں ڈیسک بھی تھے جن پر بیٹھنے سے مٹّی اور دھول سے وہ بے تکلفی ختم ہوگئی جو پچھلے چار سالوں سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ قائم تھی۔ اِس کمرہ سے ملحقہ ﷲ بھروانہ کے لئے آبِ شیریں کی بہم رسانی کے ضمن میں ٹوٹیاں لگائی گئی تھیں۔ شہر کی مستورات یہاں سے پانی بھرتیں۔ ہندوؤں کے لئے دو ٹوٹیاں الگ تھیں۔ یہاں سارا سارا دن اُونچی اُونچی آوازیں لڑنے بھڑنے والی عورتوں کا ہجوم رہتا اور "غزل" اور "جواب آں غزل" کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہونے پاتا۔ دراصل یہ ہمارے گاؤں کا "پنگھٹ" تھا بعد میں جب میں نے

Marfat.com

'پنگھٹ' کے بارے میں شاعروں کے رُومان پرور خیالات سُنتے مثلاً

پنگھٹ پہ مُرلیا باجے

بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی

پنگھٹ پہ سکھین کے سنگ جب پنیا بھرن کو جاؤں

چھلک پڑے نینن کی گگری رو رو نیر بہاؤں

تو میرا ذہن اِس پنگھٹ کی طرف منتقل ہو جاتا جہاں رُومان نام کی تو کوئی چیز نہ تھی البتہ اِس لحاظ سے کٹھن ضرور تھا کہ اپنی جان بچا کر وہاں سے بخیریت واپس آنا واقعی ایک کارنامہ سمجھا جاتا۔

پانچویں جماعت میں انگریزی سے متعارف ہوا تو جناب صوفی صاحب نے انگریزی جیسی نامانوس اور نامعقول زبان سے ایسا دلنشین تعارف کرایا کہ اِس کی اجنبیّت وغیریت ختم ہو کر رہ گئی۔ یہاں سے ہی میری طالب علمی کے اُس دَور کا آغاز ہوتا ہے جو بڑا دلفریب بھی ہے اور خوبصورت بھی۔ نہایت ہی جانفزا اور خوش آئند کیونکہ یہی وہ نقطۂ آغاز ہے جہاں سے میرے شعور و دانش کے دُور افق پر ایک مختصر سا گول دائرہ بتدریج وسعت پذیر ہونا شروع ہوا۔ لیکن یہ وسعت جہاں ایک مبارک ابتداء تھی وہاں مجھے کیفیات و محسوسات کی دُنیا کے اُن معصوم تصوّرات سے محروم بھی کرتی چلی گئی جو آج تک میری یادداشتوں کا ناقابلِ فراموش حصّہ ہیں اور جن کی بدولت ؎

سہانی نمودِ جہاں کی گھڑی تھی

تبسّم فشاں زندگی کی کلی تھی

Marfat.com

فرشتے سکھاتے تھے شبنم کو رونا
ہنسی گل کو پہلے پہل آ رہی تھی

یہاں تک کہ کسی گھنے درخت پر چھپ کر گانے والی فاختہ کی "گُھگُھو گُھو" دُنیا اور ما فیہا سے بیگانہ کر دینے کے لئے کافی تھی اور شام کے اُداس دھندلکوں میں پرندوں کے غول اپنی پناہ گاہوں کی طرف اُڑ کر جانے لگتے تو مجھے یُوں لگتا جیسے یہ ہم سے ناراض ہو کر نامعلوم منزل کی طرف اُڑے جا رہے ہیں اور شائد اب کبھی لوٹ کر واپس نہ آئیں۔

بہر حال ؎

ہنستا ہوں یُوں کہ ہجر کی راتیں گزر گئیں
روتا ہوں یُوں کہ لُطفِ دُعائے سحر گیا

"کریما" اور "پند نامۂ عطّار" تو پہلے ہی ختم کر لئے تھے۔ صوفی صاحب سے گلستانِ سعدیؒ شروع کی تو ذہنی خلاء کے اُس دَور میں پڑھا ؎

گِلِ خوشبوئے در حمّام روزے
رسید از دستِ محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مُشکی یا عنبیری؟
کہ از بُوئے دلآویزے تو مستم
بگفتا من گِلِ ناچیز بودم
ولیکن مدّتِ با گُلِ نشستم
جمالِ ہم نشین در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

یہاں سے تھوڑا آگے نکلے تھے کہ ایک جھٹکا اور لگا۔

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کیں سوختہ را جاں شد آواز نیامد
ایں مدّعیاں در طلبش بے خبرانند
کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

چونکہ ذہن کی سلیٹ صاف و شفاف تھی لہٰذا حضرت سعدی علیہ الرحمۃ کے یہ نقش و نگار وہاں مستقل طور پر منعکس ہوگئے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ شیراز (ایران) میں غالباً ۵۸۹ ہجری (۱۱۹۳ء) کو پیدا ہوئے۔ اپنی عمر کی سینچری بنانے کے بعد ۶۹۱ ہجری میں وفات پائی۔ "سینچری" تو شائد اور بزرگوں نے بھی بنائی ہو گی لیکن جو چمن 'گلستان' اور 'بوستان' کی شکل میں شیخ علیہ الرحمۃ نے کھلائے ان کی مہک ایک زمانہ کو معطّر کر گئی۔

صوفی صاحب نے مجھے نماز کی طرف راغب کیا اور اس میں باقاعدگی کی بڑی دلنشین تاکید فرمائی۔ ان کے عظیم احسانات میں سے ایک یہ بھی ہے۔

انہی دنوں ثالث حضرت قدس سرہ العزیز کے ایک مرید باصفا جناب سالم صاحب والدِ محترم سے اجازت پا کر ہمیں گھڑ سواری کی تربیت دیتے تھے۔ صوفی صاحب سے چھٹی لے کر بعد از نمازِ عصر رمضان والے "پڑ" (میدان) میں یہ ٹریننگ شروع ہوتی۔ جناب سالم صاحب اپنی نگرانی میں ہمیں سوار کر کے دو گول دائروں میں چکر لگانے کا حکم دیتے۔ یہ "دائرہ" بالآخر انگریزی میں آٹھ کا ہندسہ 8 نظر آنے لگتا۔ میں شروع شروع میں ہنگامی صورتحال سے نبٹنے کے لئے زین پکڑ لیا کرتا۔ اس

Marfat.com

غلطی کو سالم صاحب نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ وہ فرماتے کہ صرف لگام سے اپنا توازن قائم رکھو۔ اسی تربیت کے دوران میں ہم نے کلّہ مارنا بھی سیکھا۔ ایک سیدھی لائن تھی جو "بولیانوالہ" سے شروع ہو کر "رمضان والے پڑ" کو چیرتی ہوئی ہمارے بنہ کی سرحد تک پہنچتی۔ اِس پر گھوڑے سرپٹ دوڑتے۔ سب سے زیادہ تیز دھیمی اور خوبصورت دوڑ والدِ محترم کی عربی النسل سرخ گھوڑی کی تھی۔ پہلے پہل میں نے اِسی گھوڑی کو والدِ محترم کے پاس دیکھا۔ علی الصبح جب اس موزوں قامت اور سُبک رفتار گھوڑی پر جب والدِ محترم سیر کو نکلتے تو راکب و مرکب کی شان ہی نرالی ہوتی۔ یہ گھوڑی اچانک مر گئی تو مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ اِس کے بعد کئی گھوڑے آئے اور گئے لیکن کوئی اِس کا بدل نہ بن سکا۔ بانو دھریانی کا ایک قد آور گھوڑا البتہ اِس کی جگہ لینے میں کافی حد تک کامیاب ہو گیا۔

سالم صاحب نے تربیت کا معتدبہ حصہ اِسی پر مکمل کروایا۔ اَب کلّہ مارنے کی طویل مشقیں اِسی پر کی جاتیں۔ سرخ رنگ کا یہ خوبصورت جانور غیر معمولی حد تک زور آور اور شوخ و شنگ تھا اور سوار کے لئے اِسے سنبھالنا ایک مسئلہ بن جاتا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۵۱ء میں جناب عبدالقدوس صاحب ہاشمی (ماموں جان) کی بارات جب رتہ شریف سے بھون کے لئے روانہ ہوئی تو کوئی بھی اِسے سواری کے لئے قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ بالآخر "قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند"۔ دراصل اُس نے اپنی جوانی ایک ایسے سوار کی خدمت میں بسر کی تھی جس کی شوکت و تمکنت سے زمانہ کی رفتار تھم جایا کرتی۔ لہٰذا یہ اِس کی عادت سی بن گئی کہ سب گھوڑوں سے آگے نکل کر چلتا۔ بارات میں سب سے کم سِن سوار میں تھا۔ اِس گستاخی کا متحمل ہونا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ رتہ شریف سے بھون پہنچتے پہنچتے

Marfat.com

اُس نے میرا بُرا حال کر دیا۔

اِس کی بعض عادات اتنی غیر معمولی تھیں کہ اُن کا تذکرہ کئے بغیر میں آگے نہیں بڑھ سکتا وہ بے حد غیور اور خود دار تھا اور "اُصولوں" پر کوئی سودا بازی" نہ کرتا۔ یہ غالباً ۱۹۴۸ء کا ذکر ہے کہ بھیرہ کے میراں صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے متولّی جناب امیر سلطان صاحب المعروف سائیں صاحب شکار کھیلنے للہ شریف آئے۔ اُن کے ساتھ ان کا لاؤ لشکر، باز اور گھوڑے بھی تھے۔ جب حویلی (نئے مکانوں) میں داخل ہوئے تو سائیں صاحب کے موٹے تازے گھوڑے نے اچانک آمادہ ہو کر اِس پر دولتیوں کی بارش برسا دی اور وہ شور مچایا کہ اللہ تیری پناہ۔ یہ بے چارہ پابند سلاسل تھا۔ صحیح طور پر اپنا دفاع بھی نہ کر سکا۔ شکاری حضرات دوسرے روز شکار کھیلنے نکل گئے اور اپنا گھوڑا بھی ساتھ ہی لے گئے۔ اسے مزید جکڑ دیا گیا تھا کہ کوئی فساد نہ کھڑا کر دے۔ بالآخر ایک روز علی الصبح جب شکاری قافلہ رخصت ہو رہا تھا اور اپنے ساز و سامان سمیت حویلی سے نکلنے ہی والا تھا کہ اِس نے ایک زبردست جھٹکے سے "سنگلی" توڑی اور صدر دروازہ سے نکلتے ہوئے اپنے حریف کو گردن سے دبوچ کر اِس زور سے اچھالا اور پھر اِس قدر زور سے زمین پر پٹخا کہ مہمان حضرات اور اُنہیں الوداع کہنے والوں نے بھاگ کر اپنی جانیں بچائیں پھر اُسے بار بار زمین پر پٹخا یہاں تک کہ وہ بے حال ہو گیا۔

بالکل ایسی ہی ناروا اور ناجائز زیادتی پرسون سکیسر میں کھبکی کے ایک گھوڑے کو اتنی سزا دی کہ وہ مرتے مرتے بچا۔ ہم سب بھائیوں کے لئے سرپٹ دوڑ کے میدان میں اُسے قابو رکھنا خاصا دشوار کام ہوتا۔ سالم صاحب بھی اِس سے محتاط رہتے۔ البتہ والد محترم کے ساتھ وہ خود بڑا محتاط تھا اور پوری سعادت مندی کے ساتھ حکم بجا لاتا۔ یہ عجیب

Marfat.com

بات ہے کہ اُن کی وفات پر اکثر لوگوں نے اسے زار و قطار روتے اور ٹپ ٹپ آنسو بہاتے دیکھا۔ میرے ذاتی مشاہدہ میں بھی آیا کہ پرانے ریلوے اسٹیشن پر جب میں اُسے لے جاتا کہ تو والدِ محترم کے فراق اور ملاقات کے شوق میں خوب اچھلتا اور کلیلیں کرتا ہوا چلتا۔ کیونکہ ریلوے اسٹیشن سے گھر وہ گھوڑے پر ہی تشریف لاتے تھے۔ لیکن جب گاڑی رکتی اور مسافروں کی بھیڑ اِدھر اُدھر چھٹ جاتی تو اتنا مایوس اور دلگیر ہوتا کہ قدم اُٹھاتے ہوئے اُسے بڑی مشکل پیش آتی اور بڑی ہی سُست روی کے ساتھ چلتا ہوا گھر پہنچتا۔ پھر کھُرلی پر اُداس کھڑا مسلسل آنسو ٹپکاتا رہتا۔ وہ دراصل ایک ایسا تبرک تھا جسے سنبھال کر رکھنا ہماری قسمتوں سے دُور بات تھی۔ وہ اَب بوڑھا بھی ہو چکا تھا اور شاید زور آور بھی اتنا نہ رہا ہو۔ بہر حال ہم نے اُسے ایک نوجوان سفید گھوڑے کے عوض غالباً پھالیہ کے کسی تانگہ بان کے حوالے کر دیا۔

کہن شاخ کہ زیر سایۂ اُو پر برآوردی
چو برگش ریخت از وے آشیاں برداشتن ننگ است

زندگی میں جو عروج اُس نے دیکھا اور اپنے سوار کے حوالہ سے عزت و احترام کا جو خراج وہ وصول کر چکا تھا اِس کے بعد یہاں زندہ رہنا اِس کے بس کی بات نہ تھی۔ تانگہ بان نے جب اُسے تانگہ کے سامنے جوتا تو کھڑے کھڑے اِس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ ؏

یہ جان تو آنی جانی ہے اِس جاں کی تو کوئی بات نہیں

Marfat.com

ایّامِ تحریکِ آزادی

گھڑسواری کی تربیت وقفوں کے ساتھ کافی عرصہ تک جاری رہی۔ اس سے صحیح طور پر بہرہ ور ہونے والے برادرِ عزیز محمد صبغۃ اللہ صاحب اور دوسرے نمبر پر جناب بھائی صاحب تھے۔ میں تیسرے نمبر پر تھا۔ جناب آتالیق محمد سالم صاحب سے یہ خصوصی تعلق تاحیات قائم رہا۔ وہ تا لتِ حضرت قدّس سرّہٗ العزیز کے عرس مبارک (سات رمضان المبارک) کو جب بِلّہ شریف پہنچتے تو پُرانی یادوں کے گلشن مہکنے لگتے۔

اُستاد اورنگ زیب صاحب کی جگہ اَب جناب اُستاد فیض محمد صاحب مغفور (زمین ضلع گجرات) لے چکے تھے۔ گویا اَب پھر دونوں شعبوں نے کام شروع کر دیا یعنی حفظِ قرآنِ پاک اور درسِ نظامی۔ اعلیٰ حضرت قدّس سرّہٗ العزیز کے مبارک دور کے بعد یہ دَور غالباً مبارک ترین متصوّر ہوگا۔ ایک طرف صوفی صاحب جیسا بے لوث اور منکسر المزاج عالمِ تدریس کے منصب پر فائز ہو گیا تو دوسری طرف اُستاد فیض محمد صاحب نے پیکرِ ایثار و اخلاص کی حیثیت میں حفظِ قرآن کریم کی تدریس کے فرائض سنبھال لئے۔ چنانچہ اِسی مقام پہ آہستہ آہستہ وہ رونقیں جو اُستاد رشید احمد صاحب کے زمانہ میں ہم نے پہلے پہل دیکھی تھیں لوٹ آئیں۔

ایک دفعہ مکمل 'جان بھان' کے بعد جمود ٹوٹنے کی ابتداء ہوئی تو صوفی کرم بخش صاحب (جموں) اور غلام نبی (لائلپور) بارش کے پہلے قطرہ کے طور پر ٹپکے۔ مولوی محمد فاضل صاحب جو بعد میں فرقہ واریت میں ملوث ہونے کے سبب اعتدال و توازن کی نعمت سے محروم ایک اچھوت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے بھی السّابِقُونَ الاَوّلُون میں سے تھے۔ اس کے بعد تو اضافہ روز افزوں بھی تھا اور روح افزا بھی۔ محمد لطیف، غلام رسول، محمد بخش از چکوڑہ کا نام بھی اوّلیت ہی کی بناء پر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اُستاد فیض محمد صاحبؒ بڑے مہربان اور شفیق اتالیق تھے ان میں ایک روایتی اُستاد کا سا رکھ رکھاؤ بالکل نہیں تھا لیکن اپنے منصب سے وہ عشق رکھتے تھے۔ چنانچہ مسجد خانقاہ شریف ایک بار پھر تلاوت قرآن پاک کی صداؤں سے گونجنے لگی اور حق تو یہ ہے کہ خلوصِ نیّت ہی کا یہ ثمر تھا کہ اِس مسند پر وہ تقریباً تیس سال مسلسل فائز رہے اور آج بھی یہ منصب انہی کے شاگردوں کے پاس چلا آ رہا ہے۔

چھٹی جماعت میں ہمارے کلاس ٹیچر منشی محمد دین صاحب پھپھرہ تھے۔ انہوں نے ماحول کو ہمیشہ غیر رسمی انداز میں درست رکھا۔ بالکل کھُلے ڈُلے اور رحم دل بھی۔ چنانچہ یہ سال ان کی شفقت اور مہربانی سے کسی ذہنی دباؤ کے بغیر گزر گیا۔ سکول کے بورڈنگ ہاؤس سے متصّل ان کی چُونے کی بھٹیاں تھیں۔ اِسی زمانہ میں انہوں نے مہمانوں کے لئے ایک قیام گاہ تعمیر کروائی اور یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ہماری کلاس نے اِس تعمیر میں اینٹیں ڈھونے کی خدمت سرانجام دی۔ جس روز وہ ہم سے یہ خدمت لیتے ہماری گویا عید ہو جاتی۔

Marfat.com

اسی سال یعنی ۱۹۴۴ء میں والدِ محترم لکھنؤ تشریف لے گئے تھے۔ جب واپس پہنچے تو ایک برطانوی نژاد صاحب رئیس نوجوان ان کے ہمراہ تھا۔ اُسے باہر نو تعمیر شدہ بنگلہ کے مشرقی کمرہ میں ٹھہرایا گیا۔ انگریز نوجوان اگرچہ قبولِ اسلام کے شرف سے مشرّف ہو چکا تھا لیکن یورپیت اس میں بدرجۂ اتم موجود تھی تاہم وہ زیادہ تر وقت والدِ محترم کے پاس خاموش بیٹھ کر گزارتا۔ ایک روز والدِ محترم کی فرمائش پر اُس نے شیش محل میں جمع لوگوں سے خطاب بھی کیا۔ تقریر اس کی مادری زبان میں تھی مترجم کے فرائض البتہ جناب صوفی احمد خان صاحب نے سرانجام دیئے تھے۔ یہ لیکچر اسلام کی آفاقیت اور عام پند و نصائح پر مشتمل تھا۔

یہ کیا معمّہ تھا اور یہ نو مسلم انگریز یہاں کیسے آگیا اس کی تفصیل میاں اللہ دین صاحب مرحوم کھیوڑہ نے اس طرح سے بیان کی کہ ”حضرت صاحب عرس مبارک حضرت مجدد الف ثانی امام ربّانی قدّس سرّہٗ العزیز کی تقریبات بابرکات سے فارغ ہو کر سرہند شریف سے سیاحت کے لئے لکھنؤ تشریف لے گئے۔ جو چند شرکاء آپ کے ہمرکاب تھے ان میں میاں اللہ دین صاحب بھی تھے۔ بہرحال یہ مادکہ حسبِ پروگرام صوبہ جات متحدہ کے مشرقی روایات کے حامل حسین و جمیل شہر میں پہنچ گیا۔ سیر و سیاحت کے مختلف پروگرام چلتے رہے۔ ایک روز حضرت صاحب لکھنؤی فیشن کی پُرتکلّف ٹم ٹم میں سوار بازار سے گزر رہے۔ بقول میاں اللہ دین صاحب جو بھی دیکھتا حیرت کی تصویر بن کر دیکھتا ہی رہ جاتا۔ سبحان اللہ لکھنؤ کے خوش ذوق و خوش لباس لوگ ایک طرف اس منظر میں گویا سما سے گئے تو دوسری طرف حضرت صاحب ”صفتِ مہِ تمامے کہ گزشت بر ستارہ“ کے مصداق گرد و پیش سے بے نیاز آگے بڑھ

Marfat.com

رہے تھے کہ اچانک ایک نوجوان فرنگی نے ایک طرف سے آگے بڑھ کر ٹم ٹم کو روک لیا۔ چند لمحوں کے لئے جیسے وہ بُت بن گیا ہو۔ پھر اچانک پاؤں پر گرا اور زار و قطار رو پڑا اور اسلام قبول کرنے کا شرف اُس کا مقدّر بن گیا۔ انگریز نوجوان نے بعد میں اس اجمال کی جو تفصیل بیان کی وہ کچھ یُوں ہے:

"میں ایک انگریز نوجوان تھا اور اپنی مذہبی رسوم کا احترام کرنے والا۔ ملازمت کے ضمن میں مجھے ہندوستان آنا پڑا۔ ایک رات میں حسبِ معمول اپنی قیام گاہ میں نیند کے لئے مخصوص کمرہ میں سو گیا۔ خواب میں ایک مسلمان بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ میں اُس بزرگ کی وجاہت و جلال سے اس قدر مرعوب ہوا کہ بے اختیار مسلمان ہونے کی درخواست کر دی اُس بزرگ نے مجھے مشرّف بہ اسلام کیا اور میں بیدار ہو گیا۔ عالمِ بیداری میں بھی اِس مخصوص کیف کو بدستور محسوس کرتا رہا۔ اِس کے بعد عجیب بے قراری سی محسوس ہونے لگی۔ یہاں تک کہ چند دنوں کے بعد پھر وہی منظر خواب میں دیکھا۔ اَب تو حالت یہ ہو گئی کہ میں اُس سراپا جلال و جمال کا تصوّر لئے دُنیا و مافیہا سے بیگانہ رہنے لگا۔ ہندوستان کے اکثر ڈپٹی کمشنروں کو قلمی تصویر کے حوالہ سے اُس بزرگ کا نام و نشان بتانے کی درخواستیں کیں مگر بے سود۔ میری مایوسی میرے قویٰ کو مضمحل کئے دے رہی تھی اور میں زبردست

نفسیاتی کشمکش میں مبتلا تھا کہ قدرت نے اُس جوہر مراد کو ڈرامائی

انداز میں عین میری نگاہوں کے سامنے لاکر رکھ دیا۔"

لِلّٰہ شریف میں اُس نے تقریباً پندرہ، بیس دن گزارے۔ اُس کا قیام نئے بنگلہ میں تھا جو والدِ محترم نے گھر کی جگہ انتہائی مختصر پاکر ۳۸-۱۹۳۷ء میں مستری فتح محمد صاحب بھلوال کی نگرانی میں تعمیر کروایا پھر ۱۹۵۶ء میں پورا گھر ہی یہاں منتقل ہو گیا۔ وہ والدِ محترم کا بے حد عاشق تھا یہ نومبر کا آخری عشرہ تھا۔ میں عیدِ قربان پر اسکی خیریت پوچھنے گیا تو اُس نے حسبِ معمول ٹوٹی پھوٹی اُردو میں کہا "ہم .... بہت کھایا۔" اِس پر حاجی میاں محمد مرزا صاحب جو پاس کھڑے تھے فوراً بول پڑے "ہم نے بھی بہت رج کے کھادھا۔" ایک دن وہ رخصت ہو گیا۔ شیلانگ سے اُس کے خطوط والدِ محترم کے نام آتے رہے۔ صوفی احمد خان صاحب عبارت کا ترجمہ کر کے خط سناتے۔

ساتویں جماعت میں اَب ہم جماعت ساتھیوں سے کچھ کچھ یگانگت کا احساس پیدا ہونا شروع ہوا۔ اس کلاس کے ٹیچر انچارج جناب ملک فیروز خان تھے جو بڑے محنتی اور لگن سے پڑھانے والے اُستادوں میں تھے۔ وہ بڑے انتھک اور تسلسل سے پڑھانے والے تھے اور علی الصبح ہی بالکل کمپیوٹر کی طرح ایک خاص انداز سے پڑھائی شروع کر دیتے۔ مقررشدہ کوٹہ کے مطابق بلا استثناء سزا دیتے اور ایک سوٹی کی ضربیں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر مارتے جاتے۔ ان کی جماعت میں ہمیں پہلی دفعہ "باقاعدگی" کے مفہوم کو سمجھنے کا موقع ملا۔

آٹھویں جماعت اس سکول کی آخری جماعت تھی۔ اس کے اُستاد جناب مولوی محمد امین صاحب تھے۔ 'ورنیکلر فائنل' کے امتحان کا ایک انجانا سا خوف

Marfat.com

سوار رہنے لگا۔ مولوی صاحب اس کی اہمیت کے پیشِ نظر شروع سال ہی سے بڑی

لگن سے پڑھانا شروع کر دیتے۔ ہمارا مانیٹر گاؤں کے ایک معروف سنارہیرا لعل

کا بیٹا سری رام تھا۔ تمام مضامین مولوی صاحب خود پڑھاتے البتہ انگریزی وہ

نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ اس سکول کے انتہائی شریف النفس اور معمّر ہندو ہیڈ ماسٹر

لالہ جی مہارام انگریزی کا پیریڈ لیتے۔ وہ بڑے قابل اور انگریزی کے مانے ہوئے اُستاد

تھے۔ سختی بالکل نہ دارد اِس کے باوجود نظم وضبط برقرار رہتا۔ انگریزی میں بڑے بڑے

خوبصورت چٹکلے ان کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتے۔ ایک دفعہ پند ونصائح کے

دوران ان کی زبان سے نکلا۔ "سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں" تو کوئی طالب علم بول

اُٹھا اس کو انگریزی میں کیسے ادا کریں گے تو فرمانے لگے۔

"BLISS IS SHORT LIVED"

یہ وہ دن تھے جب غیر ملکی حکمرانوں سے نجات کا مسئلہ پورے ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط کر چکا تھا۔ مسلم لیگ اور کانگریس واضح طور پر اپنا پروگرام پیش کر چکی تھیں۔ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" قائدِ اعظمؒ کا پیغام عامتہ المسلمین کو مسحور کر چکا تھا۔ چونکہ ہمارا گاؤں مسلم اکثریت کا علاقہ تھا۔ ہندو آبادی زیادہ مستعد و متحرک نظر نہ آتی۔ چنانچہ ایک صبح جناب ہیڈ ماسٹر صاحب کے بیٹے کے سینے پر "جے ہند" کا بیج دیکھا تو میں اس اصطلاح سے بہت حیران ہوا۔ معلوم ہوا کہ "لے کے رہیں گے پاکستان"، "بن کے رہے گا پاکستان" کا یہ ایک جوابی نعرہ ہے۔

انہی دنوں اسلامیہ کالج لاہور کے طالب علموں کا ایک وفد حافظ سلطان بخش صاحب ولد میاں امیر بخش صاحب مغفور (للہ ہندوانہ) کی قیادت میں گاؤں آیا۔

وفد سید ھا والدِ محترم کے پاس پہنچا اور اپنے تبلیغی پروگرام کا خاکہ پیش کیا۔ والدِ محترم نے خوش ہو کر میزبانی کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ وفد کا تبلیغی پروگرام کیا تھا۔ دن کو مختلف مساجد میں دو قومی نظریہ پر مبنی پاکستان کی ضرورت و اہمیت بیان کرنا اور رات کو دیر تک ٹولیوں کی شکل میں مسلم لیگ کا منظوم دستور بڑی دلکش آوازوں میں گلی کوچوں کے اندر بصورت "کورس" گاتے پھرنا ان کی سادہ اور پرسوز لے میں وہ جادو ہوتا کہ اللہ تیری پناہ۔ گاؤں کے سادہ منش لوگوں کے لئے یہ نسخہ واقعی تیر بہدف ثابت ہوا ورنہ بعض گوشے بڑے مؤثر انداز میں گاندھی کی "درویشی" اور پنڈت جواہر لعل نہرو کی سیاست کے حق میں رطب اللسان تھے اور مولینا ابو الکلام آزاد کے علمی تفوّق کے حوالے سے سادہ لوح دیہاتیوں کو دو قومی نظریہ سے یکسر بے خبر رکھنے کی کوشش میں مصروف۔

انہی ہنگاموں کے دوران جو بڑے ایمان افروز اور ولولہ انگیز تھے۔ حکومتِ ہند نے عام انتخابات کا اعلان کر دیا۔ انہی انتخابات کے نتائج کے طور پر "ہند" اور "پاکستان" کا فیصلہ ہونا تھا۔ انتخابی مہم آہستہ آہستہ اپنا مزاج گرم کرتی گئی۔ راجہ غضنفر علی خان مسلم لیگ کے اُمیدوار تھے تو ایک اور راجہ صاحب غالباً راجہ لہراسب یونینسٹ پارٹی کے نامزد جس کے منشور کا خلاصہ تھا۔

در دیر نیازِ من در کعبہ نمازِ من
زُنّار بدوشم من تسبیح بدستم من

غالباً یہ کانگرس ہی کی کوئی ذیلی شاخ تھی کیونکہ قائدِ اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے آفاقی پروگرام کو سبوتاژ کرنا اُس کا اصل مشن تھا۔ مجھے یاد ہے کہ مسجد میں والدِ محترم نے معززین شہر کو بُلا کر اُن سے عہد لیا کہ وہ اپنی رائے مسلمانوں کے اجتماعی

Marfat.com

مفاد (مسلم لیگ) کے حق میں استعمال کریں گے اور پھر ان سب حضرات کو اپنے برادرِ اصغر جناب عمِ محترم کی زیرِ سرکردگی ووٹ ڈالنے کے لئے ڈھڈھی تشریف روانہ کیا جہاں پولنگ بوتھ، بنایا گیا تھا۔

اس ضمن میں ایک دو دلچسپ واقعات مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ انتخابی مہم کی گہما گہمی کے دوران میں یونینسٹ بھی والدِ محترم کے پاس آئے اور اپنے لئے تائید و امداد کی درخواست کی والدِ محترم بالکل خاموش رہے۔ یہ ملاقات عصر کے وقت اُوپر بنگلہ یا ہر پھپھروں کے کوٹھہ سے متصّل کھلی چھت پر ہوئی۔ والدِ محترم نے اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ بوقت رخصت سربراہ وفد نے مصافحہ کے وقت نوٹوں کی دو تھیاں اوورکوٹ کی دائیں بیرونی جیب میں ڈال دیں۔ کچھ دیر بعد جب والدِ محترم نے ہاتھ جیب میں ڈالا تو ٹھٹھک سے گئے۔ نوٹوں کو جیب سے نکالا اور حیرت و استعجاب سے اِن کو دیکھنے لگے۔ ساتھ ہی چہرہ کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ بغیر کچھ کہے انہوں نے رقم کو پھپھروں کے صحن میں اچھال دیا۔ افسوس کہ اُس وقت تک وہ "مخیر" حضرات جا چکے تھے ورنہ وہ یہ منظر بچشمِ خویش دیکھتے اور دُنیا کے مروّجہ اصولوں کے برعکس ایک دوسرے اصول کا تجربہ بھی کر لیتے ۔

دلِ بے نیازے کہ در سینہ دارم
گدا را دھد شیوۂ بادشاہے
چہ پروین فرو ناید اندیشۂ من
بدریوزۂ پرتوِ مہر و ماہے

Marfat.com

اگر آفتابے سوئے من خرامد
بشوخی بگردانم او را ز راہے

راجہ غضنفر علی خان کی ملاقات بھی مجھے یاد ہے۔ یہ بعد از نمازِ مغرب شیش محل میں ہوئی۔ والدِ محترم گلی والی باری کے ساتھ گاؤ تکیہ لگائے تشریف فرما تھے۔ راجہ صاحب مع اپنی جماعت کے جب صدر دروازہ سے داخل ہوئے تو بکمالِ احتیاط سگریٹ گُل کی۔ برآمدہ سے گزر کر جب شیش محل میں داخل ہوئے تو اچانک گھٹنوں اور کہنیوں کے بل چلنا شروع کر دیا اور والدِ محترم کی نشست تک اِسی طرح ایک شیر خوار بچے کی طرح چلتے گئے۔

مسلم لیگ کے انتخابات کے ضمن میں "سدھن" پر ایک جلسۂ عام بھی منعقد ہوا۔ میں بھی تماشائی تھا۔ راجہ غضنفر علی کے اِس جلسہ کی صدارت کھارہ کے ایک سفید ریش پیر صاحب نے کی۔ میں اِن کی صورت سے اِس لئے متاثر ہوا کہ کھارہ کے پیروں کا متشرّع ہونا بلندیوں سے اپنی رفعتوں سے دور بات تھی۔ یہ بزرگ پیر امیر شاہ صاحب مغفور تھے۔ اسی جلسہ میں راجہ صاحب مرحوم کے گزشتہ انتخابات کے مبنی بر دروغ وعدوں پر مخالف جماعتوں، بالخصوص مجلسِ احرار کی طرف سے بڑی باغیانہ لے دے ہوئی تھی۔

اسی رونق میلہ کے دوران پیر صاحب سیال شریف کی آمد تھی۔ پیر صاحب مسلم لیگ کے حق میں "تبلیغ" کے ضمن ہی میں آ رہے تھے۔ صوفی علی محمد کفش دوز اُن کا مریدِ خاص تھا وہ بڑی محنت سے سوہل کا مغربی کنارہ کسّی سے موٹر کے لئے ہموار کرتا رہا۔ شام کے قریب معلوم ہوا کہ پیر صاحب کہیں اور تشریف لے گئے ہیں۔

Marfat.com

عین اُسی رات کو مسجد خانقاہ شریف کے شمالی حجروں میں آگ بھڑک اُٹھی۔ رات کافی جا چکی تھی میں ایک بے ہنگم سی افراتفری پر جاگا تو باہر "رڑری" "پرر پرما ٹیوں" کے ڈھول کی خوفناک تھاپ کسی ناگہانی مصیبت پر فوری اور ہنگامی امداد کے لئے فریاد کر رہی تھی۔ ماحول سخت پُراسرار تھا۔ معلوم ہوا کہ باہر مسجد کے حجروں میں آگ آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ چونکہ یہ کمرے درویشوں کی رہائش گاہ بھی تھے۔ میں دم بخود ہو کر بیٹھ گیا اور دل ہی دل میں خیریت و عافیت کی دُعائیں مانگنے لگا۔ افسوس کہ علی الصبح جب میں جائے حادثہ پر پہنچا تو۔ ع

آگ کچھ ایسی لگی گھر میں کہ جو تھا جل گیا

والا معاملہ تھا۔ سامان، کپڑے، بستر، چارپائیاں سب کچھ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکے تھے۔ اِس پر مستزاد یہ کہ ایک نابینا طالب علم جو ہمارا ہم جلیس تھا۔ بڑا ہنس مکھ شریف اور معصوم زندہ نہ بچ سکا۔ مغربی حجرے کی شمال مغربی باری کے ساتھ اُس کے وجود کے کچھ باقیات اٹنار پڑے تھے۔ یہ منظر آتنا دہرد انگیز اور اذیت ناک تھا کہ دیکھنے والوں کی چیخیں نکل گئیں۔ بعد از نماز عصر مسجد کے صحن میں چارپائی کا سہارا لے کر والد محترم حادثہ کی تفصیلات سُن رہے تھے۔ میں پاس کھڑا تھا۔ آگ بھڑکنے کی ابتدا سے لے کر حجروں سے طالب علموں کے انخلاء کے مراحل تک تمام جزئیات وہ نہایت خاموشی سے سُنتے رہے۔ ان کے چہرے پر غیر معمولی کرب کے آثار بڑے نمایاں تھے۔ راوی جب حافظ نابینا کی بے چارگی کے قصہ پر پہنچا تو اُن کی آنکھیں اچانک چھم چھم برس پڑیں۔ انہوں نے ہاتھ پیشانی پر رکھ کر اس سیلاب کو روکنا چاہا لیکن ایسا نہ کر سکے۔ فرمایا کرتے تھے کہ اسی سال سرہند شریف عرس مبارک پر حاضری

Marfat.com

کے لئے تمام تیاریوں کے باوجود روانگی نہ ہو سکنے کی اصل وجہ یہی تھی۔

بہرحال بات تھی آٹھویں جماعت اور اُس کے ماحول کی چونکہ سکول میں گویا "ایم۔اے" کی کلاس تھی چنانچہ قدرتی طور پر سب کی نگاہیں اسی پر مرکوز تھیں۔ ہمارے خصوصی آتالیق مولوی محمد امین صاحب مغفور جب غصّہ میں یہ فرماتے کہ "میں نے ایسی نالائق جماعت زندگی میں نہیں دیکھی تھی"، تو ہماری گردنیں ندامت سے جُھک جاتیں۔ بعد میں البتہ ہمیں پتہ چل گیا کہ یہ فقرہ وہ معمولاً دہراتے تھے۔ ملک عمر حیات ٹومھہ، ملک محمد ریاض عرف پیر صاحب، ڈاکٹر حافظ محمد شریف (امریکہ) عمر احمد ھرڑ سری رام، جلال الدین محمد اکبر اور محمد ایوب ولد صوبیدار لال خان صاحب مرحوم اس جماعت کے چند سرکردہ طلباء میں سے تھے۔ جب موسم سرما نے رنگ جمانا شروع کیا تو مولوی صاحب اور زیادہ سنجیدہ ہو گئے۔ حتّٰی کہ رات کو بھی کلاس لینا شروع کر دی۔ محمد ایوب صاحب مذکور اور میں شام کو اکٹھے سکول جاتے۔ یہی وہ دن تھے جب پہلی مرتبہ میں نے اِن کی زبان سے سُنا ؎

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تُو بُرا نہ مانے

تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پُرانے

وہ شام کو بڑے ہلکے پھلکے موڈ میں ہوتے اور آنے والے امتحان کی تلخی کو ترنّم کی حلاوت میں تحلیل کرنے کی کوشش کرتے۔ نئے نئے فلمی گانوں سے بھی وہ اچھی طرح متعارف تھے جنہیں وہ بڑے ذوق سے گنگناتے ؎

ساون کے بادلو! اُن سے یہ جا کہو

تقدیر میں یہی تھا ساجن میرے نہ رو

Marfat.com

آندھیاں غم کی یوں چلیں باغ اُجڑ کے رہ گیا
سمجھے تھے آسرا جسے وہ بھی بچھڑ کے رہ گیا
زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے
بج رہا ہے اور بے آواز ہے
جب تم ہی چلے پردیس لگا کر ٹھیس او پریتم پیارا
دُنیا میں کون ہمارا

ترنّم کی خوبی ایک طرف لیکن میں یہ خیال کرتا کہ فلمی ماحول خاصا مادر پدر آزاد ہوگا جسے میرے نزدیک 'لوفرانہ' قرار دینے میں کوئی حرج کی بات نہ تھی۔ اب اسے انحطاطِ زمانہ کا 'اعجاز' سمجھئے یا کچھ اور بہر حال اب یہ گیت "صوفیانہ" معلوم ہوتے ہیں بلکہ "صوفیوں" کے ایک خاص طبقۂ خیال کی مجالس میں 'وجد آفرینی' کا کام بھی ان سے بآسانی لیا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

ورنیکولر فائنل کا امتحان

حاصل کلام یہ کہ 'فائنل' امتحان کی تیاری کے یہ دن بڑے یادگار تھے۔ کیونکہ اس سے آگے پھر جماعت کے ایک 'خاندان' ہونے کا تصوّر باقی نہ رہ سکا۔ ہم طالب علم آپس میں گھُل مل گئے تھے اور ہر لڑکا اپنی اور دیگر ہم جماعتوں کی کامیابی کے لئے دست بدعا رہتا۔ درحقیقت یہ جناب مولوی محمد امین صاحب مغفور کی ذاتی سرپرستی اور اُن کی بے پایاں شفقت کا ثمر تھا کہ "تاریخی طور پر نالائق ترین" جماعت کا نتیجہ مثالی رہا اور دو ایک کے سوا سب کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔

۴ فروری ۱۹۴۷ء کی سہ پہر بڑی میلی اور اُداس تھی۔ فائنل امتحان کا سنٹر پنڈدادنخان گورنمنٹ ہائی سکول وہ مقام تھا جسے میں وظیفہ کے امتحان کے ضمن میں ۱۹۴۳ء میں بھی دیکھ چکا تھا میں گھر سے جناب صوفی احمد خان صاحب مدظلہٗ العالی اور جناب مولٰینا غلام دستگیر صاحب میروی (حال جہلم) کے ہمراہ پنڈدادنخان کے لئے روانہ ہوا۔ یہ وہ دن تھا جس دن منشی چنن دین صاحب انتقال کر گئے۔ منشی جی اس زمانے میں معمّر ترین انسان متصوّر ہوتے۔ وہ بڑے دراز قامت اور ہر نماز مسجد خانقاہ شریف میں ادا کرنے کے عادی تھے۔ علمِ پٹوار کے ماہر۔ نمازِ ظہر کے بعد وہ اکثر میرے پاس بیٹھ جاتے اور اپنی پیرانہ سالی کے باوجود بڑی دلچسپ باتیں سُناتے۔ صوفی صاحب اُن

Marfat.com

سے احتراماً کوئی تعرّض نہ کرتے۔ "زلیخا" کے اسباق میں تو وہ باقاعدہ شریک رہتے اور مولینا جامیؒ کے اندازِ بیان کا صوفی صاحب کی تشریح و توضیع کے توسّل سے اندازہ کرکے محظوظ ہوتے۔ بہرحال ایک بزرگ، ہم سبق، کا ایسے وقت آخری سفر پر روانہ ہونا میرے لئے ذہنی اور قلبی دباؤ کا باعث ہوا خاص طور پر اس لئے کہ میں ان کے اس خاموش سفرِ آخرت میں ایک جونیئر پارٹنر کی حیثیت سے شریک ہونے سے بھی قاصر تھا۔

پنڈدادنخان میں ہم جناب میاں سیف الدین صاحبؒ خلیفۂ مجاز حضرت صاحب ڈھڈی شریف قدّس سرّہٗ العزیز کے مہمان تھے۔ مسجد سے ملحق جنوبی کمرہ میں سامان رکھ کر مسجد میں داخل ہوئے تو فضا فیضانِ خاص سے معمور پائی۔ یہاں جناب میاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ پینسٹھ، ستّر برس کے بزرگ سادہ و پُر سوز۔ لال سُرخ داڑھی چہرے پر روشنی کی شعاعیں چھوڑ رہی تھی۔ اتنی بے اعتنائی سے ملے کہ میں پریشان ہو گیا۔ تقریباً نصف مصافحہ پر اکتفا اور وہ بھی یوں کہ چہرہ اپنائیت کے تاثرات سے یکسر مبّرا۔

"نہ طریقِ آشنائی نہ رسومِ جام و بادہ"۔ خیریت تک نہ پوچھی۔ زبردست سادگی کے باوصف لوگ ان کی موجودگی میں مؤدب اور خاموش تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر اپنی رہائش گاہ پر گئے تو ایک بزرگ ہمارا کھانا اُٹھائے کمرہ میں داخل ہوئے۔ میں مزید پریشان ہوا کہ یہ خود حضرت میاں صاحب تھے۔ اتنے خدّام اور درویشوں کی موجودگی میں یہ کسر نفسی، سُبحان اللہ۔ جتنے روز وہاں قیام رہا اِس معمول میں فرق نہ آیا حتّٰی کہ صبح کی چائے بھی خود ہی لے کر آتے اور ہر دفعہ خلوص و مروّت کا ایک نیا نقش چھوڑ جاتے۔ وہ پُرانے نقشبندی بزرگوں کا نمونہ تھے۔ پاک اور لطیف

Marfat.com

جذبوں کا اظہار ان کے نزدیک گناہ تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ تقریباً دو سال بعد جب وہ والدِ محترم کی تعزیت کے لیئے تشریف لائے تو میں بھی اتفاق سے شیش محل میں موجود تھا۔ وہ نہایت خاموشی سے اندر داخل ہوئے اور چپ چاپ دو زانو بیٹھ گئے۔ اسی مسلسل خاموشی کے عالم میں اچانک ان کی آنکھوں سے موٹے موٹے قطرے اُبل پڑے مگر یہ سیلاب کمال ضبط کے ساتھ انہوں نے اپنی آنکھوں کے اندر ہی جذب کر لیا۔ حضرت علامہ نے فرمایا تھا ؎

سرمایۂ دردِ تو غارت نتواں کردن
اشکے کہ ز دِل خیزد در دیدہ شکستم من

امتحان جناب صوفی صاحب کی سرپرستی میں بفضلِ اللہ تعالیٰ بخیر و خوبی سرانجام پایا۔ امتحان سے فراغت دراصل بوریت کے ایک طویل سلسلہ سے نجات کا دوسرا نام تھا۔ واپس پہنچا تو موسم کی گھٹن فضا میں بکھری ہوئی خوشبوؤں اور خوشنما پھولوں کی مُسکراہٹوں میں تبدیل ہو چکی تھی اور "نوا ہا زندہ شد در شاخساراں" کا سماں تھا۔ میرے لئے ایسی "ہمہ گیر" فراغت کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اگرچہ اس عرصہ میں "زلیخا" (مولینا جامی) اور "سکندر نامہ" (مولینا نظامی) کے اسباق جاری رہے۔ تاہم امتحان کی لٹکتی ہوئی تلوار سر سے ٹل گئی۔

جناب سالم صاحب سے گھڑ سواری کے جو دو چار طریقے سیکھے تھے اب اِن سے دل بہلانے کے علاوہ کوئی دوسرا شغل نہ تھا۔ "شکار" البتہ میری ایسی کمزوری تھی کہ کھیلنا تو درکنار محض اس کی تجویز یا لائحہ عمل پر غور کرتے ہی سے طبیعت کچھ سے کچھ ہو جاتی۔ چنانچہ اَب پھلا ماچھی سے شکاریات کی دلچسپ داستانیں سُننے اور

Marfat.com

شکار کے پروگرام بنانے کے علاوہ کوئی صحیح دلچسپی نہ تھی۔

زمانۂ ہوش کے ابتدائی ایام میں میں دیکھتا کہ کبھی کبھار والدِ محترم کافی دیر سے تشریف لاتے ایک مخصوص گروہ ان کے ساتھ پہنچتا اور شش محل میں ہرنوں، اُڑیالوں اور بعض اوقات شکاری پرندوں کے ڈھیر لگ جاتے۔ اُس شام اُن کی طبیعت بڑی خوشگوار ہوتی۔ اُن کے ساتھی اُن سے خاصی بے تکلف گفتگو کرتے۔ یہ شکاری جماعت فضل محمد عرف پھلّو ماچھی، عظیم کفش دوز اور محمد بخش (ڈھڈھی شریف) اور شیر شدیال وغیرہ پر مشتمل ہوتی۔ ان میں سے ہر ایک اپنی ذات میں اک انجمن تھا۔ منشی محمد حسن صاحب بھی اگرچہ اسی جماعت کے ایک فرد تھے تاہم اُنہیں مکمل طور پر اِس گروہ میں ضم کرنا غالباً درست نہ ہوگا۔ ویسے تو اُن کے والد بزرگوار صوبیدار علی حیدر مرحوم بھی والدِ محترم کے شکاری رفیق رہے تھے لیکن مجھے ان کی پیرانہ سالی کے علاوہ کچھ یاد نہیں۔ روایت ہے کہ آخری عمر میں نظر کی کمزوری کے باعث وہ 'بھال' کے قابل نہ رہے تھے اور کسی دوسرے ہمراہی کے فائر سے بھٹ تیتروں کی ڈار جب اُڑتی تو اندازے سے فائر کر دیتے اور کچھ گرا بھی لیتے۔

بہرحال ان سب پروگراموں کا میں بصد حسرت و یاس نظارہ کیا کرتا اور جب کبھی والدِ محترم میری موجودگی میں شکار کے ساز و سامان اور اپنے مخصوص گروہ کے ہمراہ رخصت ہوتے تو میرے دل میں حسرتوں کی ایک دُنیا آباد کر جاتے۔ خلافِ توقع ایک روز مجھے بھی ساتھ چلنے کی اجازت مِل گئی۔ مختصر سا ایک آدھ گھنٹہ کا پروگرام تھا "سلیماں والی ہِن" تک۔ یہاں بھٹ تیتر عین وقت پر

Marfat.com

آتے اور پانی پی کر واپس چلے جاتے۔ میری موجودگی میں والدِ محترم نے فائر کیئے۔ وہ فائر اِس قدر تیزی سے کرتے تھے کہ خود ان کے شکاری معاصر انگشت بدنداں رہ جاتے۔ ان کا نشانہ حیران کُن حد تک درست تھا۔ یہاں تک کہ اُن کے ہمعصروں میں کوئی بھی ان کا مدِّ مقابل نہ تھا۔ "سلیماں والی ٹوٹی" پر اُس روز شکار نہ ہو سکا۔ جو بھٹ تیتر آئے وہ اتنے بلند پرواز تھے کہ بارہ بور کے پلّے سے باہر ہی رہے اور فائروں کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

میری پھلّو سے ابھی تک صحیح شناسائی نہ تھی۔ البتہ اس کی مونچھوں سے نیچے ہونٹوں سے پھوٹتی ہوئی مُسکراہٹ میں بڑی اپنائیت تھی۔ یہ شخص چالیس کے پیٹے میں تھا لیکن زمامِ اختیار دماغ نہیں دل کو تھما رکھی تھی۔ "کھراڑی" یعنی دامانِ کوہ سے لے کر بلند چوٹیوں اور دشوار گزار گھاٹیوں کے چپّے چپّے سے نہ صرف واقف بلکہ ان کے ساتھ وابستہ بڑی بڑی قیمتی داستانیں جب وہ اپنے مخصوص لہجے میں سناتا تو گزرے ہوئے زمانے کا حُسن اپنی اصلی شکل میں ظاہر ہونے لگتا۔ وہ اتنا پُر مجلس انسان تھا کہ اُس کے ہمعصر اس کے بغیر شکار کا نام لینا بھی گناہ سمجھتے۔ شکارگاہ میں پہنچتے ہی وہ میرِ کارواں کے فرائض سنبھال لیتا اور پھر سبھی اِسی کے تابع فرمان ہو جاتے۔ فنّی لحاظ سے معمولی سی چوک اُس کا "موڈ آف" کر دیتی اور پھر ساری جماعت بلالحاظِ حیثیت و منصب اُس سے کنّی کتراتے۔ خراب موڈ میں اُس سے بات کرنے کا خطرہ مول لینا آسان بات نہ تھی۔

ایک مرتبہ "مُلّاں والے ڈھیر" سے برادرِ عزیز محمد صبغۃ اللہ صاحب فائر خطا کر کے واپس آ رہے تھے۔ پیچھے پھلّو سخت غصّہ میں محوِ انتظار۔ صبغۃ اللہ صاحب نے اُوپر

Marfat.com

ہی سے اپنے دفاع میں کچھ کہنا شروع کر دیا۔ بھلّو نے وہیں کھڑے کھڑے زور سے کہا:

"تھلّے آؤناں تے میں تہنڈا ڈھڈھ چھنڈیندا اں"

یہ غالباً ۱۹۴۵ء کی بات ہے کہ خاصی تعداد میں غیر تربیت یافتہ شکاریوں کی جماعت پیر کھارہ سے مغرب کی طرف "بیہڑا" اور "مُھوّاں" کی طرف شکار کو نکلی صاحبزادہ عبدالرحمٰن صاحب و مسعودالرحمٰن صاحب از نور خانے والا بھی اِس میں شامل تھے۔ بھلّے نے بڑی دُور سے ہزار جتنوں کے ساتھ اُڑیالوں کو "اُولا" اور بکمالِ مہارت کے ساتھ محمد بخش پہ لا رہا تھا کہ اُڑیال غیر شکاری اراکین جماعت کی غیر سنجیدہ حرکات کی بھنک پا کر اصل راستہ سے ہٹ گئے اور کسی دوسری طرف بھاگ گئے۔ اِس طرح ایک نہایت کامیاب 'اولا' بالآخر پورے شکار کی ناکامی پر منتج ہوا۔ بھلّو کو اِس صورتِ حال کی پوری خبر تھی۔ جب وہ دونوں واپس آئے تو ہم بھلّو کی نگاہ سے چھپنے کی کوشش کرتے رہے۔ بہر حال اُس نے ہماری خوب خبر لی اور قسم اُٹھائی کہ میں آئندہ ایسی 'غیر شکاری' جماعت کے ساتھ کبھی شکار کے لئے نہیں آؤں گا۔ یہ دراصل اِس کے (PRESSRURC TACTICS) تھے ورنہ دوسری صبح کو وہ اتنا ہی تر و تازہ اور شکار کے پروگراموں کی جان ہوتا۔ بہر حال اس ناکام شکار سے واپسی پر سارے راستے وہ اپنے اصلی موڈ میں نہ آیا۔ ہم بھی محتاط رہے۔ جب یہ جماعت چچا جان کی حویلی کے قریب پہنچی تو شکاری فضا کی گھٹن گویا اب ختم ہو رہی تھی۔ مسعودالرحمٰن صاحب اِس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھلّو کے قریب ہو گئے اور بڑی رازداری سے پوچھا۔

"آج تم ناراض کیوں ہو؟"

Marfat.com

پھلّو ایسے خداداد موقع کو ضائع کرنے کی غلطی نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ ساری جماعت کو سُنا کر بلند آواز سے کہا:

"میں وُ جھنہ مارو ساؤں" . . . .

سارے دن کی تھکاوٹ اور ریوریت قہقہوں میں تحلیل ہوگئی۔

شکار میں نو وارد حضرات اس کی جولانیٔ طبع کا خاص طور پر نشانہ بنتے چنانچہ یٰسین موچی کو 'میر شکاری' کہتا۔ صوبیدار لال خان صاحب پر ایسی ایسی بر موقع بھبتیاں کستا کہ مجلس زعفران زار بن جاتی۔

شکار کے میدان میں وہ والدِ محترم کے علاوہ محمد بخش ڈھڈھی شریف اور کسی حد تک منشی محمد حسن صاحب کو شکاری تسلیم کرتا۔ "سردارا دھیہ" نامی ایک صاحب البتہ پُرانے زمانے میں گزرے۔ ان کا ذکر اصلی شکاریوں کے ضمن میں کرتا۔ عظیم صاحب ڈھڈھی شریف کو بمشکل برداشت کرتا۔ شکار گاہ کے اندر شکار کے آداب میں نے اسی سے سیکھے اگرچہ پہلا فائر میں نے عظیم مذکور کی زیرِ ہدایت کیا جو لگ گیا۔ مجھے یاد ہے کہ اُس روز مع بھائی صاحب قبلہ بھٹ تیتر اور گرین شکار کر کے بھراڑی سے واپس آ رہے تھے۔ تاہم یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ شکار میں جناب بھائی صاحب اور برادرِ عزیز صبغتہ اللہ کی مہارت مجھ سے بہتر تھی۔ ان دونوں کی تربیت بھی پھلّو نے ہی کی تھی درحقیقت وہ ہم سب بھائیوں سے بڑی شفقت سے پیش آتا۔ والدِ محترم کی وفات کے بعد جب پہلی مرتبہ شکار کا پروگرام مرتب کرنے بیٹھے تو آبدیدہ ہو کر اُس نے اس شعر سے ملتے جُلتے الفاظ ادا کئے ؂

Marfat.com

سر آمد روزگارِ ایں فقیرے

دگر دانائے راز آید کہ ناید

وہ مسلسل ۱۹۸۰ء تک اپنی جسمانی کمزوری اور بصارت میں کمی کے باوجود خسکاریات کے موضوع پر گفتگو اور پروگراموں کا مرکزی نقطہ تسلیم کیا جاتا رہا۔ وہ والدِ محترم کا ہمعمر تھا۔

جون ۱۹۸۰ء کی بات ہے میں وہاڑی سے معراج شریف میں شمولیت کیلئے گھر آیا تو مجھے یہ سُن کر بہت پریشانی ہوئی کہ بھلّو بیمار ہے۔ میں شام کے دُھندلکے میں برادرِ عزیز محمد صبغۃ اللہ صاحب کے ہمراہ اُس کے گھر پہنچا تو:

یکسر وہ اُستخوانِ نقاہت، سے چُور تھا

اُس نے اُٹھ کر ملنے کی ناکام کوشش بھی کی۔ زندگی جو رنگینیوں اور رعنائیوں سے بھرپور رہی تھی اپنے منطقی انجام کے قریب پہنچ کر ٹھہر سی گئی تھی۔ میں بظاہر تیمارداری میں مصروف، صاحبِ فراش کے ماضی کی انتہائی دلآویز فلم اپنے ذہن کے ویڈیو سسٹم پر دیکھتا رہا اور جب اس منظر پر پہنچا ے

آج ہیں خاموش وہ دشتِ جُنوں پرور جہاں

رقص میں لیلےٰ رہی لیلےٰ کے دیوانے رہے

تو ضبط میرے بس کی بات نہ رہی۔ میں اپنے پُرانے رفیق غمخوار اور بزرگ سے زندگی کا آخری مصافحہ کر کے بھاگ نکلا۔

Marfat.com

گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب ـــــ سرودھی

غیر نصابی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں کہ "فائنل" کا نتیجہ آگیا۔ والدِ محترم کے سامنے "ہائی کلاسز" کے لئے دو ہی ایسے ہائی اسکول تھے جہاں مجھے وہ داخل کرا سکتے تھے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈدادنخان کی طرف ان کی طبیعت مائل نہ تھی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول خوشاب میں البتہ اُس وقت جناب مولانا محمد معصوم صاحب مغفور عربی ٹیچر تھے اور والدِ محترم کے ساتھ ان کو بے حد عقیدت تھی۔ غالباً مولانا نے از خود یہ پیشکش کی تھی اور انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ میں البتہ خوشاب سے اس کی اجنبیت کی وجہ سے خائف تھا۔ بہر حال جب نویں جماعت میں داخلے کے لئے خوشاب پہنچا تو طبیعت اُداس تھی۔ مولانا خوشاب کے مغربی محلہ "رنیچاں والا" میں حافظ ہدایت صاحب کی مسجد سے متصل ایک مکان میں رہائش پذیر تھے۔ مولانا کی کوئی اولاد نہ تھی لیکن دونوں میاں بیوی بڑے سکون اور اطمینان سے اپنی مدّتِ حیات پوری کر رہے تھے۔ رسول بی صاحبہ جناب مولانا میاں احمد دین صاحب کھتکہ کی بیٹی تھیں جو بڑے متّقی اور پرہیزگار عالم دین تھے۔ ایک آدھ مرتبہ وہ میری موجودگی میں اپنی بیٹی کے پاس آئے۔ شریعت کے معاملہ میں اُن سے زیادہ بے لاگ آدمی کم دیکھنا نصیب ہوا۔ غالباً نانی حضرت قدس سرّہ العزیز سے بیعت تھی اور اتنے راسخ العقیدہ نقشبندی تھے کہ شیش محل میں حضرت قلندرؒ (چاچڑ شریف) کی قوالی

Marfat.com

پر سب سے زیادہ جاندار احتجاج انہی کا تھا۔

اسکول میں ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد نصف سے زائد تھی۔ البتہ ان کی چال ڈھال سے اندازہ ہوتا کہ "چل پڑنے کے دن آئے"۔ ہندوستان ایک زبردست انقلاب کے دھانے پر کھڑا تھا اور تقسیم ملک کا مرحلہ لحمہ بہ لحمہ قریب آرہا تھا۔ بہرحال نویں جماعت کے طالب علم کی حیثیت سے تعلیم کا آغاز ہوگیا۔

مولانا محمد معصوم عربی، جناب محمد منظور صاحب اردو، جناب ملک نثار الدین صاحب انگریزی اور جناب عبدالسلام صاحب حساب کے استاد تھے۔ اسکول کی عمارت خاصی اچھی اور انگریزی حرف 'ا' کی طرز کی بنی ہوئی تھی۔ دونوں بازوؤں میں طویل گیلریاں تھیں۔ ہائی کلاسز کے طلباء مغربی بازو میں ہی بیٹھتے۔ صبح کی "تعریف" جناب حافظ عبدالرشید صاحب پڑھتے اور ایک سماں باندھ دیتے۔ مولانا مجھے نماز جمعہ کے لئے مسجد 'بادشاہاں' لے گئے جو خوشاب کے جنوب میں قدیم اور وسیع قبرستان کے ایک کنارے پر واقع ہے۔ 'بادشاہوں' کے مزار پر جب حاضری دی تو اطمینان وسکون کی دولت سے مالا مال گھر پہنچا۔

گھر سے باہر رہنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ طبیعت بالکل بجھی بجھی سی رہنے لگی اور کبھی کبھی تو یہ اندر کا غبار آنکھوں سے بھی چھلک پڑتا: ؏

در سینہ نیاسائی از دیدہ بروں آئی

مجھے اپنے گاؤں کی گلیاں، وہاں کا ماحول، بچپن کے ساتھی اور گھر کی یاد اس قدر ستاتی کہ دل ڈوبنے لگتا۔ میں اگرچہ زیادہ اچھا کھلاڑی نہ تھا تاہم اسکول کی فٹ بال ٹیم کا کپتان نامزد ہوگیا۔ ایک شام اسکول کے گراؤنڈ سے بدیر لوٹا۔ مسجد کے نمازی مغرب کی نماز ادا

Marfat.com

کر کے گھروں کو جا چکے تھے۔ مولینا البتہ ابھی نوافل ادا کر رہے تھے کہ میں بھی پہنچ گیا۔ ہم اکٹھے مسجد سے باہر آئے مولینا نے ہدایت فرمائی کہ شام کو دیر سے لوٹنا ایک بُری عادت ہے۔ آئندہ ایسا نہ ہو، نیز فرمایا کہ نمازِ مغرب با جماعت ادا کی جانی چاہیے۔ عام نصائح کے ضمن میں یہ پہلی اور تقریباً آخری نصیحت تھی جس پر میں نے اپنے دو سالہ قیام کے دوران حتّی الامکان عمل کیا۔

میں ہفتہ کی شام جب گھر آتا تو گھر والے میرے لئے سراپا انتظار ہوتے اپنے ماحول میں لوٹ آنے اور والدہ ماجدہ کی زیارت نصیب ہونے سے طبیعت پرسکون ہو جاتی ہے

بے تکلف خندہ زن ہیں فکر سے آزاد ہیں

پھر اُسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

قیامِ پاکستان کے بعد والدِ محترم نے ایک بیٹری ریڈیو سیٹ خرید لیا جو کہ گاؤں میں پہلا ریڈیو تھا۔ وہ باقاعدگی سے خبریں سُنتے بلکہ مسجد کے نمازیوں کو بھی اِس میں شامل کر لیتے۔ وہ تقسیمِ ملک کے نتیجہ میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات سے سخت مضطرب رہتے۔ اخبار کا انتظار اُن کے لئے اعصاب شکن ہوتا۔ شکیل احمد جو اُردو خبریں پڑھنے کا ایک خاص اسلوب رکھتے تھے، کا لب و لہجہ بہت پسند فرماتے۔ ریڈیو کے بعد جب میں پہلی مرتبہ گھر آیا تو ریڈیو سُننے کا شوق بے تاب کئے ہوئے تھا۔ میں خبروں کے بعد گھر پہنچا تھا اور آپ والدِ محترم سونے کے لئے باہر تشریف لے گئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ اندر تشریف لائے۔ سب لوگ اِس خلافِ معمول آمد پر حیران رہ گئے۔ انہوں نے مجھے اشارہ سے بُلایا اور بنگلہ کے اندر ریڈیو کے پاس لے گئے۔ ریڈیو بنگلہ میں جنوب مغربی

Marfat.com

کونے میں ایک بڑے میز پر رکھا تھا۔ فرمایا یہ ریڈیو ہے تمہیں کیسا لگا؟ میں نے اُس خوبصورت سیٹ کی بہت تعریف کی اور پھر ریڈیو قاہرہ سے آذان سنوائی تو عربی اور پنجابی لہجہ کے فرق کا پہلی دفعہ انکشاف ہوا۔

بہر حال پڑھائی جاری تھی کہ موسم گرما کی چھٹیاں شروع ہوگئیں۔ یہ دو تین ماہ کا عرصہ قائدِ اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی مومنانہ فراست اور عزم و استقلال کا صحیح امتحان تھا اور مسلمانانِ ہند کی قسمت کا فیصلہ بس اَب ہوا ہی چاہتا تھا۔ دوسری طرف رمضان المبارک کی آمد آمد تھی اور والدِ محترم اس بار روزے بمقام سردھی رکھنے کے تمام انتظامات کر چکے تھے۔ سردھی گاؤں کے جنوب میں بلکہ فرلانگ دو فرلانگ ہٹ کر 'گالہ' کے مقام پر مستری غلام رسول صاحب (سردھی) کی معرفت زمین کا کچھ ٹکڑا بوچھال خورد کے ایک شریف النفس زمیندار میاں وارث سے حاصل کر لیا گیا تھا 'گالہ' کوہستانِ نمک کا وہ جنوبی کنارہ ہے جہاں سے وتھل کا بھرپور نظارہ ممکن ہے۔ جنوب میں سرگودہا سے بھی آگے 'کرانہ' پہاڑی کا منظر اور مشرق میں ملک وال کی روشنی صاف نظر آتی ہے۔ اِس مقام پر بالخصوص خنک ہوا مسلسل چلتی رہتی ہے اور گرمیوں میں بھی یہاں سردیوں کی سی کیفیت محسوس کی جا سکتی ہے۔

گزشتہ سال والدِ محترم رمضان المبارک کے مہینہ میں شملہ تشریف لے گئے تھے۔ جہاں جناب بھائی صاحب نے مولانا محمد معصوم صاحب کی 'سماعت' میں قرآنِ پاک سُنایا تھا۔

تقسیم ملک کی آمد آمد کے پیشِ نظر اِس دفعہ یہ سفر ممکن نہ تھا۔ سردھی میں دو کمرے تعمیر کئے گئے۔ صوفی صدرالدین کفش دوز اس خدمت میں پیش پیش تھا۔ تقریباً ۱۶ جولائی ۱۹۴۷ء کو رمضان المبارک کا یہ قافلہ بعد نمازِ ظہر للہ شریف سے چل پڑا۔ والدِ محترم کے ہمراہ صوفی صدرالدین صاحب مذکور تھے۔ حتّٰی کہ جب 'کھراڑی' میں جھکڑ کا سامنا ہوا تو والدِ محترم نے

کھوڑا ایک جھاڑی نما درخت کی اوٹ میں کرلیا۔ بہر حال اِس نئے مستقر پر سب سے اوّل وُرودِ میرا اور صوفی امام الدین "جیٹھل" کا ہوا۔ پہاڑوں میں گھرا ہوا یہ ویرانہ شام کے دُھندلکے میں بڑا خوفناک معلوم ہوا لیکن جب کارواں کے شرکاء آکر "گرنا" شروع ہوئے تو کچھ ہمت بندھ گئی اور میرِ کارواں جب تشریف لائے تو یہ افسردہ خزاں گویا بہار میں تبدیل ہوگئی۔

یہاں اِس جنگل کو آباد کرنا خاصا جان جوکھوں کا کام تھا۔ رہائش کے لئے صرف دو کمرے تھے۔ شمالی کمرہ والدِ محترم کے لئے مخصوص تھا۔ اُنہوں نے کھوکھر بالا کے ایک جان نثار صوبیدار نور محمد المعروف "کھیلا" جن کا نومبر ۱۹۸۶ء میں بمقام بھکّر انتقال ہوا، سے ایک رہائشی خیمہ مستعار لیا تاکہ کچھ سہولت پیدا ہو۔ شرکائے کارواں نے اِس مبارک مہینہ کی ابتداء کلامِ الٰہی کی تلاوت سے اِس انداز میں کی کہ پہاڑ کے پہاڑ گونج اُٹھے۔ علی الصبح جب والدِ محترم تھل کا نظارہ کرتے تو وہاں کے حبس اور یہاں کی مسلسل لطیف اور خنک ہوا کا تقابل کرکے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے، فرماتے:

چپّے اُتّے وسداں کُہی کشمیر بنائی ہوئی آ

اگرچہ رمضان شریف کے معمولات۔ بجائے خود ایک امتحان سے کم نہیں ہوتے تاہم سرڈھی میں انہوں نے بہت سا تعمیری کام اپنی موجودگی میں کرایا۔ میاں محمد دین حجّام مرحوم لاہور مستقلاً اُن کی خدمت میں رہے۔ مولوی محمد جی صاحب مغفور از دلیری (راولپنڈی) میاں غلام جیلانی صاحبؒ رتّہ شریف رمضان المبارک میں اِن سے ملنے آئے اور اِس طرح اِس قافلے کے شرکاء میں اپنا نام درج کرا گئے۔

میں اور برادرِ عزیز محمد صبغۃ اللہ صاحب شکار وغیرہ کے بہانے نیچے باغوں میں چلے جاتے اور خاصے دشوار پہاڑی سفر کے باوجود روزہ کا خاص احساس نہ ہوتا۔ اکثر عربی

سمت والی پہاڑی پر پرانے تعمیر شدہ سکول کے غیر آباد کمروں میں وقت گزارتے۔ مستری غلام رسول صاحب کے گھر "واجا" سننے بھی چلے جاتے۔ پرانے ریکارڈ تھے۔ ایک قوالی ہمیں بہت پسند تھی ؎

آنکھ کھلتے ہی تصوّرِ یار کا رُو پوش تھا

پھر وہی میں تھا وہی دریائے غم کا جوش تھا

ایک مرتبہ مستری صاحب والدِ محترم کی فرمائش پر "واجا" گالہ پر بھی لے آئے۔ انہوں نے گانا "اِک تیرا سہارا سُنا" تو دیر تک عالم محویت میں گم سُم بیٹھے رہے۔ انہوں نے جنوبی طرف نسبتاً ایک نیچی سطح کی ڈھیری پر اپنے لئے ایک تھڑا سا بنوا لیا تھا۔ ایک بَل کھاتے ہوئے راستے سے علی الصبح اُوپر جاتے اور وہاں کرسی پر بیٹھ کر اس بلندی سے گرد و نواح کا نظارہ کرتے رہتے۔ اسی مقام پر ان کی ملاقات پیر صاحب کھارہ شاہ غلام صاحب سے ہوئی تھی وہ غالباً "میدان" سے واپس جا رہے تھے کہ والدِ محترم کو تنہا دیکھ کر رُک گئے اور اُوپر ڈھیری پر جا کر اُن سے ملاقات کی۔

۱۹۴۸ء کی عید الفطر ان کی زندگی کی آخری عید تھی اُس روز علی الصبح وہ حسبِ معمول اسی تھڑا پر بیٹھے تھے کہ مجھے اشارہ سے اُوپر بُلایا میں وہاں جا کر نیچے بیٹھ گیا۔ پوچھا روزے پورے رکھے ہیں۔ میں نے کہا پہلا روزہ مشکوک تھا رہ گیا ہے فرمایا ایسا نہیں ہونا چاہیئے تھا اب اسے قضا کر لینا۔

۱۹۴۷ء کے رمضان المبارک کی ستائیسویں رات ۱۴ اگست کو تھی۔ علی الصبح جمعتہ الوداع تھا اور دُنیا کے نقشہ پر حضور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کی ایک سلطنت معرضِ وجود میں آ رہی تھی۔ اُس رات بہت ہی مسرور و مطمئن تھے۔ ختمِ قرآن پاک کے بعد اسی جگہ بیٹھے رہے۔ حافظ محمد لطیف چکوڑہ کو غالباً اس کے والد کی خواہش پر داخلِ طریق

Marfat.com

کیا۔ معاً بعد مجھے بلایا اور مجھے بیعت کے لئے فرمایا۔ یہ حکم خلافِ توقع بھی تھا اور خلافِ معمول بھی۔ میں نے خوشگوار حیرت کے دوران اپنے ہاتھ ان کے مبارک ہاتھوں میں دے دیئے۔ سب شرکائے مجلس ہم دونوں کی خوش بختی پر رشک کر رہے تھے۔ یہ جمعرات کا دن تھا اور ستائیسویں کی شب تھی۔ میں آج بھی اپنی اس خوش نصیبی پر نازاں و فرحاں اللہ جل شانہٗ کا شکر ادا کرتا رہتا ہوں۔

غالباً یہی سبب ہے کہ سردھی سے ایک خاص قلبی اور روحانی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد وہاں سال بہ سال جانے کا معمول تو ختم ہو گیا لیکن وہ تعلقِ خاطر آج بھی بدستور قائم ہے چنانچہ ایک طویل مدت کے بعد ۱۹۸۶ء کے رمضان المبارک میں ڈاکٹر ریاض احمد صاحب بللہ کے ہمراہ اٹک سے میں جب بھائی صاحب کو ملنے سردھی گیا تو وہاں جا کر طبیعت کو سنبھالنا خاصا مشکل ثابت ہوا۔

ختمِ خواجگان سے فارغ ہو کر میں اپنے پرانے تاریخی اور متبرک مستقر کی طرف نکل گیا۔ کون تھا اُس وقت جو میرے احساسات و تاثرات کا احاطہ کرتا۔ میں دم بخود دیر تک اُن آثار کو دیکھتا رہا جن کے کنارے کبھی ایک پُر نور کارواں نے ڈیرے ڈالے تھے۔ میں فرداً فرداً اُن "باقیات الصالحات" کے پاس گیا اور عالمِ بے خودی میں اُن سے بڑی بڑی راز کی باتیں کیں۔ بعض آثار تو مجھے دیکھتے ہی نوحہ کناں ہو گئے۔ وہ اپنی اصلی حالت پر اسی طرح قائم تھے اور اُنہوں نے اسی حالت میں والدِ محترم کی زیارت کی تھی ؎

بہ یزداں روزِ محشر برہمن گفت
فروغِ زندگی تابِ شرر بود
ولیکن گر نہ رنجی با تو گویم
صنم از آدمی پائندہ تر بود

Marfat.com

(قیامت برپا ہوئی تو ایک برہمن نے داورِ محشر کے حضور
گزارش کی کہ بتی نوعِ انسان بڑی ناپائیدار چیز تھی۔ اگر آپ
معاف فرمائیں تو میں عرض کردوں کہ اِس سے تو میرے بنائے
ہوئے بُت زیادہ پائیدار تھے)

میں ان کی ڈھیری والی نشست گاہ پر گیا۔ یہاں ہی اُنہوں نے مجھے زندگی کی آخری نصیحت فرمائی تھی۔ اِن کی نشست گاہ مرورِ زمانہ کے باعث بالکل درہم برہم ہو چکی تھی۔ یہ خوبصورت ہموار اور مُصفّا دائرہ اُب بمشکل ایک نشان کی صورت میں باقی تھا۔ زمانہ کی ناپائیداری اور زُود فراموشی سے میرا دم گھٹنے لگا۔ میرا جی چاہا کہ پورے زور سے دھاڑیں مار مار کر شور مچاؤں مگر ایسا کر نہ سکا۔ میں نے چاہا کہ اِس متبّرک یادگار کی کچھ نوک پلک ہی سنوار دوں۔ لیکن اِسے چھیڑنے کی بھی ہمّت نہ ہوئی ؎

سحر مے گفت خاکستر صبا را
فسرد از بادِ ایں صحرا شرارم
گزر نرمک پریشانم مگرداں
ز سوزِ کاروانے یادگارم

(ایک صبح خاکستر صبا سے مخاطب ہوئی کہ اس صحرا کی ہوا
ہی سے میری چنگاری بُجھ گئی تھی۔ تم اپنی رفتار کو آہستہ رکھو
اور مجھے پریشان نہ کرو کیونکہ میں تو کسی زمانے میں یہاں
سے گزرنے والے کارواں کے الاؤ کی یادگار ہوں)

دو سال متواتر والدِ محترم نے رمضان المبارک سرِدھی میں گزارا اور اِس ویرانے کو رشکِ بہاراں کرتے رہے۔ ۱۹۴۸ء میں وہ کچھ روز کے لئے مزید ٹھہر گئے لیکن ہم سب بھائی واپس آ گئے۔ انہی دنوں میں وہ تاریخی موسلا دھار بارش برسی جس سے

Marfat.com

اللہ شریف کے اکثر مکان منہدم ہو گئے۔ پیر کھارہ گاؤں بارشی نالہ "سوہل" کی نظر ہو گیا اور اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ العزیز کی مسجد کا مینار بھی ایک بڑی دراڑ نمودار ہونے کے باعث شہید کرنا پڑا۔

وہ بڑی ہی بھیانک رات تھی۔ جناب بھائی صاحب برادرانِ عزیز محمد صبغۃ اللہ صاحب اور محمد حجۃ اللہ صاحب، حافظ غلام مرتضٰے از دیوی (ضلع راولپنڈی) اور میں مسجد خانقاہ شریف میں نمازِ مغرب ادا کر کے بارش تھمنے کا انتظار کر رہے تھے کہ حاجی میاں محمد مرزا صاحب درویش جو اُس وقت تک صرف "میاں مرجا" تھے، نے خفگی سے کہا کہ بارش کے آثار خیریت کا پتہ نہیں دے رہے۔ آپ لوگ گھر جائیں وہاں کوئی بھی نہیں۔ اُس وقت عام گلیوں میں بھی پانی گھٹنوں کے قریب تک بہہ رہا تھا۔ ہم گھر پہنچے تو دادی جان اور ہمشیرہ صاحبہ کی جان میں جان آئی۔ ہم اُوپر بنگلہ میں بیٹھے تھے رات آہستہ آہستہ پُراسرار ہوتی جا رہی تھی بارش کی کمی کے دُور دُور تک کوئی آثار نہ تھے۔ پہلے پہل تو خوش گپیوں سے گزارا ہوتا رہا لیکن گردونواح کے مکان جب گرنا شروع ہوئے اور اُن کے مکینوں نے آسمان سر پر اُٹھایا تو ہمیں حالات کی سنگینی کا صحیح احساس ہوا۔ اِس پر مستزاد یہ کہ دادی جان حضرت ماجی مٹھے والے مسلسل دھمکیاں دے رہے تھے کہ ہم باہر آ رہے ہیں۔ ہمارے سمجھانے بجھانے اور منّت سماجت سے وہ کچھ رُک جاتے۔

بے چارگی اور بے بسی کا احساس لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا کہ ہمارے ہمسایوں یعنی پھپھیروں کا ایک کوٹھا زبردست دھماکے کے ساتھ زمین بوس ہو گیا۔ اب تو ماجی کو روکنا ہمارے بس کی بات نہ رہی تھی۔ انہوں نے ہمشیرہ صاحبہ کو پکڑا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے اِس اعلان کے تکرار کے ساتھ باہر آ گئے کہ "ہم بھی آ رہے ہیں۔ ہم بھی آ رہے ہیں۔" غلام مرتضٰے فوراً دوسری طرف ہو گیا اور وہ برآمدہ میں آ کر بیٹھ گئے۔ مکانات کا انہدام

Marfat.com

جاری رہا۔ سحر کے وقت نالہ 'سوہل' کی طرف سے ایسا شور سنائی دیا کہ پھر سننے میں نہیں آیا۔ ایسا پتہ چلتا کہ پورے گاؤں کو بہا کر لے جائے گا۔ بارہ چودہ گھنٹے ایک ہی رفتار سے برسنے والی یہ بارش بفضلِ اللہ تعالیٰ آہستہ آہستہ تھمنے لگی جو تقریباً صبح نو دس بجے تک بوندا باندی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ آہ و فغاں کی چارسو کوئی کمی نہ تھی ماں جی کی دعاؤں کا اتنا اثر ہوا کہ اِن بے شمار حادثات میں کوئی بھی جانی نقصان نہ ہوا تھا۔

دوپہر کے قریب جب گرد و پیش کا جائزہ لینے نکلے تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ہر فرد کچھ نہ کچھ اس طوفان کی نذر کر چکا تھا۔ 'سوہل' کی طوفانی لہریں بدستور کسی ڈرامہ کا پتہ دے رہی تھیں۔ وہ صبح بھی بڑی افسردہ اور سوگوار تھی۔ بنگلہ سے متصّل گلی پہ بنایا ہوا غسل خانہ گر گیا تھا جس سے گلی کا پانی رُکا اور مسجد کی جنوبی اور شیش محل کی شمالی دیواروں میں بڑی بڑی دراڑیں پڑ گئیں۔ یہ گویا اس کیفیات سے بھرپور تجلّیات کی مخزن اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز کی اس یکتائے روزگار 'پختہ مسجد' کو گرا کر نئی مسجد تعمیر کرنے کا نقطۂ آغاز تھا۔ اگر یہ دراڑ، نمودار نہ ہوتی تو شاید عم محترم اس مسجد کو شہید کر کے نئی مسجد تعمیر کرنے کا پروگرام ہی مرتب نہ کرتے۔

اِس مسجد میں میں نے صوفی بزرگوں کو طویل مراقبے کرتے دیکھا۔ حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ (ناناجان) فرماتے کہ اعلیٰ حضرت کی اس مسجد میں جو کیف اور فیضان تھا اور کہیں بھی دیکھنے میں نہ آیا۔ مجلسِ احرارِ اسلام کے ایک سرکردہ رہنما مولٰنا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جب للہ شریف آئے تو چچا جانؒ کے ہاں مہمان ٹھہرے۔ وہ بقول عم محترم اس مسجد میں نماز پڑھ کر بڑے متاثر ہوئے اور بقول شخصے "وہابی" ہونے کے باوجود وجدان اور فیضان کی کیفیات کا بڑے ہی مؤثر انداز میں باربار تذکرہ کرتے رہے۔

Marfat.com

اعلیٰ حضرت للّٰہی قدس سرہٗ العزیز

ہمارے مورثِ اعلیٰ حضرت خواجہ غلام نبی رحمتہ اللہ علیہ ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت جمعرات کی شب ۱۲۳۴ ہجری (بعض روایات میں ۱۲۳۳ ہجری) بمقام للہ شریف ہوئی۔ سن عیسوی اگر شمار کیا جائے تو یہ ۱۸۱۸ء تھا۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولٰینا مخدوم محمد حسن دین صاحب رحمتہ اللہ علیہ للہ بھروانہ میں رہتے تھے۔ عالم دین اور متقی بزرگ تھے۔

اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ العزیز نے فارسی اور درسِ نظامی کے عربی حصہ کی ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں اور شرح مُلاّ جو کہ علم نحو کی آخری کتابوں میں شمار کی جاتی ہے تک علم کی تکمیل للہ شریف ہی میں کی۔ حصولِ علم کے لئے آپ شہر چکوال سے متصل گاؤں اوڈھروال کے ایک جیّد عالم دین حافظ محمد سردار صاحب کے پاس تشریف لے گئے اور "معقولات" جو کہ فنِ منطق ہی کی انتہائی شکل ہے کی تکمیل کی۔ اِس کے بعد پشاور میں حضرت مفتی محمد احسن صاحب، حافظ دراز صاحب اور بعض روایات کے مطابق حافظ محمد عظیم صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے ہاں باقی ماندہ نصابی کتب کی تکمیل فرمائی۔ پشاور کے جیّد علمائے دین کے ہاں آپ نے خاص طور پہ نصابِ نظامی کی وہ انتہائی کتابیں پڑھیں جن کے نام تک آجکل کے اکثر علماء کو معلوم نہیں۔ مثلاً "زواہد ثلاثہ"

Marfat.com

جو علم "معقول"، کی آخری کتاب ہے۔ شرح چغمینی (علم فلسفہ) اخوان یوسف (تاریخ و سیرت) وہدایۃ الحکمۃ اور الحکمۃ الکبریٰ (علم فلسفہ)۔ نصابِ نظامی کی تکمیل کے بعد آپ روایت کے مطابق اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی معیّت میں گھر تشریف لائے اور انہی کے زیرِ سایہ ۱۸۴۵ء میں ۲۸ سال کی عمر میں درس و تدریس کا آغاز فرمایا۔

ظاہری علوم کے حصول میں آپ نے جس غیر معمولی ذہانت و فطانت کا ثبوت دیا تھا اُس سے بھی کئی گُنا استعداد و صلاحیت حصولِ علم باطن کے لئے قدرت نے آپ کو ودیعت فرمائی تھی۔ چنانچہ جب آپ اس طرف راغب ہوئے تو اپنے پیش رؤوں کے لئے بھی ایک مثال بن گئے۔ اُس وقت پنجاب کے اندر چشتیہ نظامیہ سلسلہ کے پیرِ کامل حضرت خواجہ تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کا عام شہرہ تھا۔ آپ انہی سے بیعت کا ارادہ کر کے گھر سے روانہ ہوئے۔ بمقام شاہ پور (ضلع سرگودھا) پہنچے تو اتفاقاً حضرت مولینا خواجہ غلام محی الدین قصوری دائم الحضوری قادری، نقشبندی مجدّدی سے ملاقات ہوئی۔ حضرت پیر قصوریؒ اُس زمانہ میں نسبتِ مجدّدی کے تاجدارِ اعظم جناب حضرت شاہ غلام علی شاہ صاحب دہلوی قدّس سرہٗ العزیز کی ساری عمر کی کمائی کا حصل الحصول تھے۔ سُبحان اللہ! ؎

دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے

اِستخارۂ مسنونہ کے بعد پورے اطمینانِ قلب سے آپ نے ۱۴ ربیع الاوّل ۱۲۶۲ ہجری (۱۱ اپریل ۱۸۴۶ء) کو آپ سے بیعت کر لی۔ حضرتؒ اپنے بیاض میں اِس طرح رقمطراز ہیں ؎

"مجھ فقیر غلام نبی کی ولادت شب پنج شنبہ کو ہوئی۔ نکاح بھی شب پنج شنبہ (جمعرات) ہی کو ہوا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسی

شب کو حضرت پیر دستگیر عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی۔ ۱۴ ربیع الآخر ۱۲۶۲ ہجری میں حضرت قصوری شیخ غلام محیّ الدین رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اپنے پیرِ دستگیر کی صحبت کی تفصیل یوں ہے:"

پہلی بار ۔۔۔۔۔ چار روز	کل مدتِ قیام گیارہ ماہ ایک دن
دوسری بار ۔۔۔۔۔ ایک ماہ	
تیسری بار ۔۔۔۔۔ ڈیڑھ ماہ	
چوتھی بار ۔۔۔۔۔ بیس دن	
پانچویں بار ۔۔۔۔۔ تین روز	
چھٹی بار ۔۔۔۔۔ چھ ماہ آٹھ روز	
ساتویں بار ۔۔۔۔۔ دس روز	
آٹھویں بار ۔۔۔۔۔ تئیس روز (۲۳ دن	
نویں بار ۔۔۔۔۔ آٹھ روز	

حضرت پیر قصوری دائم الحضوری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۲۱ ذی القعدہ ۱۲۷۰ھ (۱۵ اگست ۱۸۵۴ء) کو ہوئی۔ گویا بیعت کے بعد آپ کو صرف تقریباً آٹھ سال تک اپنے مرشدؒ کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ اِس قلیل عرصہ میں آپ نے اپنے رہبرِ کامل سے کیا حاصل کیا۔ اِس کے بارے میں حضرت پیر قصوریؒ اپنے مکتوبات میں ارشاد فرماتے ہیں:

"حضرت مولوی غلام نبی جو ایک کامل الاستعداد مرد تھے، موضع للّہ سے

Marfat.com

جو بھیرہ کے قریب ہے۔ پچھلے ماہ کاتک میں نسبت احمدیہ مجددیہ کے اکتساب کے لئے فقیر کے پاس آئے۔ چھ ماہ تک اِس میں مشغول رہے اور سلوک کو حقیقت الحقائق، تک پہنچا کر رخصت ہوئے۔ ان کی استعداد کے بارے میں کیا لکھا جائے کہ اِس میں بے نظیر تھے۔ بارک اللہ فیما اعطا۔"

سُبحان اللہ! جس مردِ باصفا کے بارے میں اِس کے مرشدِ باخدا کے تاثرات ابتداء ہی میں ایسے ہوں۔ اس کی باطنی استعداد اور روحانی صلاحیت کے بارے میں مزید کوئی تبصرہ اُس کے مرشدِ اکمل کے مقابلہ میں گُستاخی کے مترادف ہوگا ؎

وادیٔ عشق بسے دُور دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بر آہے گاہے

(محبّت کی وادی بڑی طویل مسافت پر واقع ہے لیکن
یہ دُور دراز کا سفر بعض اوقات ایک آہِ سرد سے بھی
طے کر لیا جاتا ہے۔)

حضرت قدّس سرہٗ العزیز نے جب اپنے پیرِ دستگیر رحمتہ اللہ علیہ سے مراقبۂ "کمالاتِ نبوّت" کی اجازت پائی تو حفظِ قرآنِ حکیم کی طرف یوں ہمہ تن وہمہ وقت متوجہ ہوئے کہ صرف چھ ماہ میں قرآنِ پاک حفظ کر کے رمضان المبارک میں سُنا بھی دیا۔ مولٰینا امام دین کھوتکوی مؤلف "مقاماتِ طیّبین" جس میں اُنہوں نے اپنے مُرشد کے حالات و کوائف بزبانِ فارسی قلمبند کئے تھے اور جس کا ترجمہ سیّد احمد سعید ہمدانی نے جو اسی گاؤں کے ایک فاضل بزرگ ہیں نے تقریباً ایک سو

Marfat.com

سال بعد کیا۔ تحریر فرماتے ہیں :

"جب آپ کے مرشد حضرت قصوریؒ کو آپ کے قرآنِ کریم حفظ کرنے کی اطلاع ہوئی تو۔۔۔۔ اس سے اُنہیں اِسقدر مسرت ہوئی کہ حیطۂ تحریر سے باہر ہے۔"

حضرت دائم الحضوری قدس سرہٗ العزیز نے اپنے ایک مکتوب شریف میں تحریر فرمایا :

"فَحَمْدُ اللّٰہ ثُمَّ حَمْدٌ لَّہٗ حفظ کلامِ الٰہی خصوصاً اہلِ آگاہ کے لئے نعمت ہے کہ اِس کے برابر کوئی نعمت نہیں ہوسکتی۔"

اعلیٰ حضرتؒ کے معاصرین اِس بارے میں متفق ہیں کہ آپ جلال وجمال کا ایک حسین امتزاج تھے۔ آپ نے اس "وادیٔ غیر ذی زرع" کی کایا پلٹ کے رکھ دی۔ کبھی خود لِلّٰہ گاؤں کے اجڈپن کا یہ عالم تھا کہ پورے گاؤں میں حفظِ قرآن مجید بایدو شاید اور پھر کبھی وہ زمانہ بھی آیا کہ آپ کی مساعی سے بلا مبالغہ ہزاروں حفّاظ پیدا ہوئے اور یہ سلسلہ بفضلِ اللہ تعالیٰ جاری وساری ہے۔ بے شمار مسلمانوں کو اللہ کے دین اور سُنّتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ صرف راغب کیا بلکہ ان کے قلوب میں فہمِ دین اور اتّباعِ سُنّت کا ایسا ذوق پیدا کر دیا کہ اُن کے دل اِس نور سے منوّر ہوگئے۔ دُور دُور تک کے علاقوں سے طالبانِ حق آپ کے چشمۂ فیض سے حسبِ استطاعت اپنی پیاس بُجھاتے۔ "کریما"، شیخ سعدیؒ سے لیکر منطق و معقول فلسفہ وحکمت بشمول حدیث شریف وتفسیر تک تمام اسباق بنفسِ نفیس پڑھاتے۔

جناب مولینا امام دین صاحب لکھتے ہیں کہ آپ کے درس میں ستر، اسی طلباء ہمیشہ زیرِ تعلیم و تربیت رہتے۔ بقول مولینا:

"ہر طالب علم کے لئے ظاہری و باطنی دلداری علیحدہ علیحدہ ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ پچاس سے زائد طلباء وظیفہ حضرتؒ سے لیتے تھے اور ان میں سے بعض تو اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتے تھے مثلاً حضرت مولوی بزرگ اللہ جوایا صاحب مصنّف "رسالہ نوری" حافظ رکن الدین عکوڑہ (چکوال) مولوی اللہ دین صاحب نیکی والا اور مولوی محمد ابراہیم صاحب شہیداں والی (گجرات) وغیرہم"۔

مستقل مزاج ایسے کہ نمازِ تہجد سے قبل غسل کرنے کا عمل یومِ وفات کو بھی قضا نہ ہوا۔ غرضیکہ ان کی جلائی ہوئی شمع کی لَو اتنی پُر نور اور روشن تھی کہ ایک جہان اس کی شعاعوں سے مستنیر ہو گیا۔ یہاں تک کہ آج اِس گئے گزرے دَور میں بھی اِس فیضان کے گہرے نقوش حاضر و موجود ہیں۔

چنانچہ جون ۱۹۷۴ء میں مَیں کسی کام کے سلسلہ میں لاہور گیا۔ الحاج حافظ محمد اشرف صاحب کلیار (سرگودھا) سے ملا تو معلوم ہوا کہ مولینا درخواستی ان کے ہاں تشریف فرما ہیں۔ مولینا نے بعد از نمازِ ظہر ایک مختصر سی مسجد میں حاضرین سے بڑا دلنشین خطاب فرمایا، سادہ و پُرسوز۔ یہاں سے اُٹھے تو کسی عقیدت مند کے ہاں جانے کا پروگرام تھا۔ کلیار صاحب کی موٹر میں اگلی نشست پر بیٹھ گئے۔ مجھے بھی اسی میں سوار ہو کر گجرات کے لئے بس پکڑنا تھی۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ راستہ میں مولینا نے کلیار صاحب سے دریافت فرمایا کہ یہ اجنبی

کون ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ میرا دوست ہے نام بہت پسند فرمایا۔ پھر پوچھا کہاں کا رہنے والا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ ضلع جہلم میں ایک گاؤں ہے "للہ" میں وہاں کا رہنے والا ہوں۔ مولینا نے اچانک مڑ کر مجھے بغور دیکھا اور فرمایا "للہ" مت کہو "للہ شریف" کہو۔ میں خاموش ہو گیا۔ پھر فرمایا کہ اس گاؤں میں ایک بزرگ گزرے ہیں جن کی مساعی سے بے شمار خلقت نے راہ ہدایت پائی۔ آپ ان سے متعارف ہیں۔ میں جواباً کچھ عرض کر کے مولینا کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میرے دوست نے فوراً کہہ دیا کہ یہ اسی خاندان کا ایک فرد ہے۔ اس پر حضرت نے فوراً گاڑی رکوائی اور خود گاڑی سے باہر تشریف لائے۔ میں عرقِ انفعال میں غرق باہر نکلا تو اُنہوں نے مجھے گلے لگا لیا اور اپنے ساتھ اگلی سیٹ پر بٹھایا۔ بے پایاں شفقت فرمائی اور پُر تاثیر دُعاؤں کے ساتھ رخصت فرمایا۔ سبحان اللہ۔

آں فقر کہ بے تیغے صد کشورِ دل گیرد

از شوکتِ دارا بہ از فرِّ فریدوں بہ

آپ کی وفات سے چند روز قبل یعنی ربیع الاوّل ۱۳۰۶ ہجری (نومبر ۱۸۸۸ء) ایک طالب علم نے آکر اسباق شروع کرنے کی درخواست کی۔ فرمایا ایک سفر درپیش ہے اگر نہ گیا تو سبق شروع کرا دونگا تم فلاں تاریخ کو آجانا۔ طالب علم مقررہ تاریخ ۲۴ نومبر ۱۸۸۸ء کو پہنچا تو آپ کی تجہیز و تکفین ہو رہی تھی۔ آپ نے اپنی مسجد میں قبل از نماز ظہر مسواک طلب فرمایا اور مؤذن کو اذان کے لئے کہا۔ مؤذن جب کلمہ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور بعض روایات کے مطابق اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ پر پہنچا تو آپ یہی کلمہ دہراتے ہوئے پیچھے جُھکتے گئے اور فرشِ مسجد پر دراز ہو گئے۔

آپ کی مفصّل سوانح عمری تو افسوس کہیں بھی دستیاب نہیں البتہ بعض خلفاء

نے آپ کے مختصر حالات قلمبند کئے۔ ان تصنیفات میں سب سے زیادہ شہرت "حالات مشائخ نقشبندیہ" کو حاصل ہوئی جسے آپ کے خلیفۂ اجل حضرت مولینا محمد حسن خان صاحب رحمتہ اللہ علیہ ساکن کوٹلہ ضلع بجنور (یو۔پی) بھارت نے تقریباً ۱۹۱۳ء میں مکمل کیا تھا۔ یہ تصنیف اپنے موضوع اور افادیت کے اعتبار سے منفرد تھی جس کی وجہ سے اسے قبولِ عام حاصل ہوا۔

"مقاماتِ طیبین" مولینا امام دین صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے جو آپ کے خلفاء میں سے تھے، فارسی میں تصنیف کی۔ جس کا اردو ترجمہ "تذکرہ اعلیٰ حضرت للّٰہی" کے نام سے جناب سید سعید احمد ہمدانی نے شائع کرایا۔

ملفوظات اعلیٰ حضرت للّٰہیؒ مرتبہ مصنف "حالات مشائخ نقشبندیہؒ" اور مکتوبات اعلیٰ حضرت للّٰہیؒ بھی مرتب کئے گئے۔ اس کے علاوہ حضرت پیر قصوری دائم الحضوری قدس سرہٗ العزیز کے خلیفہ حضرت مولینا صالح محمدؒ کنجاہی (گجرات) نے اپنی تالیف "سلسلۃ الاولیاء" میں حضرت للّٰہی کا نہایت دلنشین اور عقیدت سے بھرپور ذکر کیا۔ حضرت مولینا غلام مرتضےٰ رحمتہ اللہ علیہ بیرپل شریف (سرگودھا) نے بھی اپنے رسالہ میں آپ کے حالاتِ زندگی قلمبند کئے۔ افسوس کہ مؤخر الذکر دونوں کتابیں اس وقت دستیاب نہیں۔ آپؒ کے حالاتِ زندگی اور ملفوظات پر مبنی تازہ ترین تالیف "انوار حضرت للّٰہیؒ" جناب صاحبزادہ محمد مطلوب الرسول صاحب کی مرتب کردہ ہے۔

Marfat.com

اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

میں نے اپنے مورثِ اعلیٰ قدس سرہٗ العزیز کی سیرتِ پاک سے خوشہ چینی کی سعادت اِس لئے حاصل کی کہ شائد اس کی دلآویز خوشبو سے یہ اوراق بھی مہک اُٹھیں۔ حضرت امام شافعی علیہ الرحمتہ نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں فرمایا تھا:

اَعِدْ ذِکْرَ نُعْمَانَ لَنَا اِنَّ ذِکْرَہٗ
هُوَ الْمِسْكُ مَا كَرَّرْتَهٗ يَتَضَوَّعُ

نُعمان (حضرت امام اعظم کا اسم گرامی) کا ذکر تکرار سے کرتے رہو
کیونکہ وہ تو کستوری کی مانند ہے۔ اس میں جس قدر تکرار ہو گا۔
اتنی ہی زیادہ خوشبو پھیلے گی"۔

میں جب گرمی کی چھٹیاں گزار کر خوشاب پہنچا تو ہندو اور سکھ ہم جماعت عنقا ہو چکے تھے اور اِن کی جگہ وہ مسلمان طلبا لے چکے تھے جو ہجرت کی بے پناہ صعوبتیں جھیل کر اور خون کی ہولی کا تماشا دیکھ کر اس نوزائیدہ مملکتِ خداداد میں پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ بے شمار معصوم جانیں اس کی نقل مکانی کی نذر اور لاتعداد عصمتیں نذرِ برہمن،

ہو چکی تھیں۔ دریاؤں کا پانی بے گناہ مسلمانوں کے خون سے رنگین ہو ہو کر سمندر میں غرق ہو چکا تھا اور ہندو سکھوں کے زیرِ سایہ، خونِ مسلم کی اس ارزانی پر مسرتوں کے شادیانے بجا چکے تھے۔

تحریکِ پاکستان کے ایک مخلص اور درویش صفت کارکن جناب ایم۔ اے شیدا ایڈووکیٹ لاہور اپنی تصنیف "توڑ دی زنجیریں" میں ترتیبِ تاریخِ آزادی کے ضمن میں رقمطراز ہیں:

"ایک طرف بے سروسامانی، مسلمان پناہ گزینوں کی آہیں اور کیمپوں کی بھوک و پیاس کی شدّت سے بے حال بوڑھے بچے، نوجوان مرد و خواتین پر قیامت گزر رہی تھی اور دوسری طرف ہندوؤں کا غیر انسانی سلوک اِن کے زخموں پر نمک چھڑک رہا تھا۔ سہاگ لٹے، بچے چھنے، ماؤں کی ممتا پر قیامت ٹوٹی، بہنوں کی حسرتیں دل کی دل ہی میں رہ گئیں، رشتے کٹے، ناطے ٹوٹے، بیوی سے خاوند جُدا ہوا، باپ سے بیٹا بچھڑا، گھر بار اور مال و زر کی تو خیر کہانی ہی کیا تھی۔"

مغربی پنجاب میں بھی فسادات کی آگ تو بھڑکی لیکن اس کی تپش اتنی قاتل اور ہولناک نہیں تھی اور یہ ایک ردِّ عمل سے آگے نہ بڑھ سکی۔ خود ہمارے گاؤں میں جب غیر مسلموں کی بہیمیت کی داستانیں پھیلنا شروع ہوئیں تو ہندوؤں اور سکھوں کے اندر عدمِ تحفّظ کا احساس بہت بڑھ گیا۔ خاص طور پر جب گاؤں سے دودھ خرید نے والے دو سکھ قتل ہو گئے تو حالات نازک صورتِ حال اختیار کر گئے۔ ایک دن سارے ہندو سکھ منڈی کے

Marfat.com

اندر اکٹھے ہوئے کہ فرداً فرداً مارے جانے کی بجائے یکبارگی قتل ہونا ہی بہتر ہے لیکن اِس سے یہ ہوا کہ اِن کے گھر کا سامان غیر محفوظ ہو گیا اور جس کے ہاتھ میں جو چیز آئی اُس نے اُٹھا لی۔ فضل محمد عرف بھلّا ماچھی (شکاری) بھی لدّھے کے مکان سے چیزیں ڈھو رہا تھا کہ گلی سے گزرتے ہوئے ایک خوبصورت چھوٹی سی بیٹری اُس نے اُوپر میری طرف پھینک دی۔ والدِ محترم نے پوچھا یہ بیٹری کہاں سے لی ہے۔ میں نے ساری بات بتادی اُنہوں نے بھلّو کو ہاتھ کے اشارے سے منع کیا تو وہ کمالِ سعادت مندی سے ساری چیزیں مع بیٹری واپس چھوڑ آیا۔ اِس کے بعد گاؤں کے تمام ہندو مسلمان، ہو گئے۔ صحنِ مسجد اعلیٰ حضرتؒ میں ایک شامیانے کے نیچے بعد از نمازِ ظہر مولینا سیف الرحمٰن صاحبؒ نے ایک پُر مغز تقریر کی اور لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْن کی تفسیر بیان فرمائی۔ والدِ محترم نے بعض نَو مسلموں کو دعوتِ طعام پہ مدعو کیا۔ شیش محل میں یہ دعوت دی گئی تھی۔ ہندوؤں کو پلاؤ کھاتے میں نے وہاں پہلی اور غالباً آخری مرتبہ دیکھا۔ پھر اچانک یہ لوگ ایک سپیشل ٹرین میں سوار ہو کر ہندوستان سدھار گئے۔

تقسیمِ برِصغیر کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب کا ماحول یکسر بدل گیا تھا۔ نئے اساتذہ جو "مہاجرین" بن کر آئے ان میں حساب کے ٹیچر جناب عبدالسلام نہایت ہی شستہ ذوق، قابل اور ذہناً پکّے مسلمان تھے۔ طلباء میں بھی اب جذبۂ حُبّ الوطنی واضح طور پر بیدار ہو چکا تھا کیونکہ قائدِ اعظمؒ واقعی ایک عظیم اور محبوب رہنما کے رُوپ میں ہمارے دل و دماغ پہ چھا چکے تھے۔ ترکِ وطن کر کے یہاں پہنچنے والے اصحاب سُبحان اللہ روشنی کے چلتے پھرتے مینار تھے۔ اُنہوں نے یہاں پہنچتے ہی اِس ملک کو دل سے اپنا وطن سمجھ لیا بلکہ اِسی وطن کی تلاش میں ہی تو ایک صبح وہ مال گاڑی پر خوشاب ریلوے اسٹیشن پر اُترے تھے۔

انہوں نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لئے کسی مہلت یا موقع کا انتظار نہ کیا بلکہ متروکہ دکانیں

اِس طرح سنوارِیں اور ریڑھیاں اِس طرح سجائیں کہ لُطف آ گیا۔ بازار میں بڑی رونق اور

چہل پہل رہنے لگی۔ اِن لوگوں کے آنے سے مساجد کی رونقیں بھی دوبالا ہو گئیں اور ہم نے

جب ماحول میں مسلمان ہی مسلمان دیکھے تو قائدِ اعظم کا قد کاٹھ ہماری نگاہوں میں عظیم تر ہو گیا۔

خوشاب کے بازار کلاں کی جامع مسجد تقسیمِ ملک سے پہلے نمازِ جمعہ میں نصف صحن

تک بمشکل بھری جاتی تھی جبکہ اَب وہاں تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی۔ چنانچہ گرمی کی چھٹیاں

گزار کر جب پہلی مرتبہ میں اِس مسجد میں نمازِ جمعہ کے لئے گیا تو صحنِ مسجد کو کھچا کھچ بھرا دیکھ کر

طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ اُسی روز میں ابھی صدر دروازہ کی ڈیوڑھی ہی میں تھا کہ ایک

نہایت خوش الحان مولینا کو خطاب فرماتے سُنا جو مہاجر تھے موضوعِ سخن حصولِ پاکستان

کی تاریخ ساز جدّوجہد اور مسلمانانِ ہند پر توڑے جانے والے انسانیت سوز

مظالم تھے۔ ڈیوڑھی کے اندر ہی میں نے سُنا کہ مولینا بیٹری والے لاؤڈ سپیکر پر

بڑے پُر تاثیر لہجہ میں کسی شعر کا دوسرا مصرع پڑھ رہے تھے: ؎

کہ جب پہلی کرن پھوٹی تو پروانوں پہ کیا گزری

میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ اَب میں اِن کی طرف نظر جمائے اِس انتظار میں بیٹھا تھا کہ

مولینا ایسا قیمتی شعر کئی مرتبہ دہرائیں گے تو پہلا مصرع یاد کر لوں گا۔ لیکن شائد اُس

زمانے میں علمائے کرام کا علم سے لاتعلق ہونا ضروری نہ تھا وہ اپنے سلسلۂ کلام میں

ایسے آگے نکلے کہ دوبارہ واپس نہ آ سکے۔ یہاں تک کہ نماز کھڑی ہو گئی اور میں پہلا

مصرع سُننے کی حسرت ہی لے کر واپس لوٹ آیا۔ اُس دن سے لے کر ایک طویل عرصہ

تک میں اِس مصرع کے کھوج میں رہا۔ ساحر لدھیانوی کی ایک خوبصورت غزل اِسی

Marfat.com

قافیے ور دیف میں تھی لیکن اِس میں یہ شعر موجود نہ تھا نتیجتاً ایک خاموش حسرت اندر ہی اندر دبی رہی۔

چنانچہ ۱۹۷۳ء کی ایک مدھم اور یاس آفریں صبح تھی۔ چوہدری محمد صبا ایم۔اے ایل۔ایل۔بی ایڈووکیٹ جو پولیس میں میرے رفیقِ کار رہ چکے تھے سرگودھا میں میرے پاس دفتر میں تشریف لائے۔ معمول یہ تھا کہ چوہدری صاحب سے گفتگو شاعری کے دلچسپ موضوع سے شروع ہوتی اور درمیان میں کچھ پھیکی اور بے رس کاروباری گفتگو کے بعد پھر اِسی نکتہ آغاز پر آ کر ختم ہوتی۔ اُس روز میں نے اُن سے اپنی متذکرہ بالا حسرت کا ذکر کر دیا۔ میں دیر تک سکوتِ حیرت میں ان کا منہ دیکھتا رہا جب انہوں نے پڑھا۔

نہ شمعِ انجمن سمجھی نہ اہلِ انجمن سمجھے
کہ جب پہلی کرن پھوٹی تو پروانوں پہ کیا گزری

حافظ محمد صدیق صاحب تیغ میرے ہم جماعت اور ہم محلّہ تھے۔ ہم اکثر ایک ہی جگہ کورس کی کتابیں پڑھتے۔ سیّد فضل حسین، طاہر لیسین، ملک شیر محمد، عطا رسول، غلام رسول، طاہر شاہ اور محمد سرفراز ایسے ہم جماعت تھے جو کسی نہ کسی خاصیت کی بناء پر آج تک حافظہ میں محفوظ ہیں۔

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کا دن بڑا ہی حسرت ناک تھا۔ حضرت قائدِ اعظم علیہ الرحمتہ کے انتقال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ حضرت بابائے قوم کی اِس بے وقت موت نے پوری قوم پر غموں کے پہاڑ گرا دیئے۔ ہر کس و ناکس دیوانہ وار آنسو بہا رہا تھا۔ اس نوعمر مملکتِ خداداد کی کشتی کا کھیون ہار کشتی کو عین منجدھار میں چھوڑ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا تھا۔ ہمارے اُستاد جناب عبدالسلام صاحب نے سوگوار طلباء کا ایک

Marfat.com

جلوس ترتیب دیا۔ ہم کمال نظم وضبط کے ساتھ سکول سے نکلے اور مغربی دروازہ سے بازار کلاں میں داخل ہو کر مشرقی دروازہ کے پاس جا کر رک گئے۔ جناب عبدالسّلام صاحب نے اس اجتماع سے خطاب کیا وہ بڑے فاضل اور سنجیدہ شخصیت کے مالک تھے لیکن دورانِ تقریر کئی مرتبہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ میں یہاں سے اکیلا گھر لوٹا۔ چپ چاپ اور فرطِ غم سے نڈھال۔ سہگل کے یہ بول بار بار زبان پر آجاتے۔

ہم جی کے کیا کریں گے

جب دل ہی ٹوٹ گیا

خوشاب سے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت قائدِاعظم علیہ الرحمہ کے انتقال پر والدِ محترم نے اپنی تمام گزشتہ زندگی کے معمولات کے برعکس مسجد کے اندر سوگوار لوگوں کے اجتماع سے مختصر خطاب فرمایا۔ یہ بات اِن کے حوالے سے اتنی عجیب تھی کہ مجھے بطورِ خاص اِس تقریر کے بارہ میں بتایا گیا۔ میں نے دیکھا کہ واقعی ان کی طبیعت بڑی اُداس اور دکھوئی سی تھی زیادہ دیر حضرت قائدِاعظمؒ کی وفات سے پیدا ہونے والی صورتحال سے متعلق ہی باتیں کرتے رہے۔ ان دنوں انہوں نے نظر کی عینک استعمال کرنا شروع کر دی تھی۔ باریک اور خوبصورت فریم میں شفاف شیشے مطالعہ کے لئے استعمال کرتے۔ شوکت تھانوی کی ہلکی پھلکی تحریریں پسند تھیں۔ کبھی کبھار دیوان حافظؒ بھی پڑھتے اور بعض غزلیں تو بار بار دہراتے جن میں چند ابتدائی غزلیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میں نے انہیں کئی بار امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کی یہ غزل گنگناتے سُنا

خبرم رسیدامشب کہ نگار خواہی آمد

سرِ من فدائے راہے کہ سوار خواہی آمد

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف

بہ اُمید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

کششے کہ عشق دارد نگذاردت بدیساں

بہ جنازہ گر نیائی بہ مزار خواہی آمد

ان کی آواز کا ترنّم بھی بڑا پُر کیف ہوتا البتہ اِس قسم کی گنگناہٹ بڑی نایاب چیز تھی۔ جمعہ کے روز منظوم خطبہ البتہ عام شہر کائے نماز کے سامنے پڑھتے۔ کوئی اجنبی اگر شاملِ نماز ہوتا تو منہ ہی تکتا رہ جاتا۔ ۱۹۴۷ء کے رمضان المبارک میں جمعتہ الوداع کا خطبہ بمقام سرگی انہوں نے خیمہ کے اندر پڑھا۔ یہ خیمہ رہائشی مکانوں سے بجانب جنوب متصل ہی نصب تھا۔ حضرت پیر قصوری دائم الحضوری قدّس سرہٗ العزیز کا لکھا ہوا خطبہ تھا:

حَمِدْتُ اللّٰہَ حَمْدًا لا فَنَاہ۔

اِس اجتماع میں اتفاقاً ایک مسافر مولوی صاحب بھی گزرتے ہوئے شامل ہو گئے تھے کہ نمازِ جمعہ کا ثواب مفت میں مل رہا تھا۔ وہ پورے خطبہ کے دوران منہ کھولے اُنہیں تکتے ہی رہے۔ ان کے انتقال کے بعد جب بھی کبھی یہ منظوم خطبے پڑھے جاتے تو حاضرین میں اکثر رقیق القلب لوگ رو پڑتے۔ صوبیدار لعل خان صاحب تو کافی عرصہ بعد بھی اِن خطبوں کو سُنتے ہی زار و قطار رونا شروع کر دیتے۔

Marfat.com

دگر دانائے راز آید کہ ناید

ان کی حیاتِ مستعار کا آخری موسمِ سرما میری یادداشتوں کا ناقابلِ فراموش سرمایہ ہے۔ بنگلہ کے جنوب کی طرف دروں کے کھلے چھت پر تنہا ایک کرسی پر بیٹھ جاتے اور عینک لگا کر دیوانِ حافظ کا مطالعہ پورے انہماک سے کرتے رہتے۔ خوشاب سے جب بھی میں گھر آتا تو نہ معلوم کیوں چھپ کر انہیں دیکھتا رہتا۔ لطف کی بات یہ کہ اس منظر سے کبھی جی نہ بھرتا اور: ؎

بجز یں نماند مارا ہوسے و آرزوئے

حتّٰی کہ وہ دن بھی آگیا جب یہ منظر آسمان کی بے پناہ وسعتوں میں گم ہو گیا۔

میں نے دیکھ لیا تھا کہ ان کی طبیعت میں وہ اُٹھان باقی نہیں رہی وہ اکثر خاموش اور بجھے بجھے سے رہنے لگے تھے۔ اندر ہی اندر تو یہ مرض دو چار ماہ سے شروع تھا لیکن غالباً گردہ کی یہ تکلیف اب واضح صورت اختیار کر رہی تھی۔ گاؤں کی سول ڈسپنسری کے کمپاؤنڈر جو ڈاکٹر نہ ہونے کے باعث ڈاکٹر ہی کے نام سے معروف تھے ہر روز اُن کے پاس آتے اور اپنی فیس کھری کر کے چلے جاتے لیکن افاقہ کے نام کی کوئی چیز ظاہر نہ ہو رہی تھی۔ نقاہت بھی اب روز افزوں تھی۔ یہاں تک کہ وہ کاروبارِ زندگی سے عملاً دست کش ہو گئے۔

انہی دنوں اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ العزیز کا عرس مبارک تھا۔ ۲۱ جنوری ۱۹۴۹ء کو
۲۱ ربیع الاوّل ۱۳۶۸ ہجری بھی تھی۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ نقاہت اور کمزوری کی بناء پر بظاہر
یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ مسجد میں تشریف لائیں گے۔ خلافِ توقع اُٹھے وضو کیا
اور شیش محل سے اگلی نشست گاہ میں سے نکل کر مسجد کے غربی دروازہ سے داخل ہوئے۔
اور منبر پر جلوہ افروز ہوگئے۔ یہ اُن کی زندگی کا آخری خطبہ تھا۔ عجیب اتفاق یہ کہ اِس
سے قبل حضرت پیر قصوری قدس سرہٗ العزیز کے یہ منظوم خطبے انہوں نے بہت ہی کم
پڑھے تھے۔ ان نظموں کے چند اشعار تبرکاً درج کرنا مناسب ہوگا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَ الْوُجُوْدَ مِنَ الْعَدَم
وَالشُّکْرُ لِلّٰہِ الَّذِیْ بِیَدَیْہِ اَنْوَاعُ النِّعَم
ھُوَ خَالِقٌ ھُوَ رَازِقٌ ھُوَ فَاتِحٌ ھُوَ فَائِقٌ
ھُوَ فِی الْمَوَاعِدِ صَادِقٌ فَیْضَانُہٗ اَعْلَی الْاَتَم

پھر فارسی میں یہ نظم پڑھی:

خوشنود گر خواہی خدا در شرع شو ثابت قدم
در نہیٔ اُو اندر میا۔ واز امرِ اُو بیروں مرم
عزت ازُو ذِلّت ازُو۔ صحت ازُو علّت ازُو
از وے مگر دانی تو رُو۔ گر سازدت شق چوں قلم
دنیاست یارے بے وفا باکس نہ سازد دائما
ایں دفترِ پُر ماجرا۔ حرفِ فنا دارد رقم

"دنیا دوست تو ہے لیکن وفادار نہیں۔ یہ کسی سے مستقلاً نباہ کرنا

Marfat.com

نہیں جانتی۔ اِس کے تمام گزرے ہوئے واقعات پر حرفِ 'فنا'

کی چھاپ ثبت ہے۔"

آخری شعر انہوں نے مکرّر پڑھا۔ یہ اتنا حسبِ حال تھا کہ کچھ پڑھنے والے بزرگوں کی آہیں سسکیوں میں بدل گئیں۔ اس کے بعد اُنہوں نے عام ملاقاتوں کا سلسلہ بند کر دیا اور اَب وہ شیش محل سے اُوپر بنگلہ میں منتقل ہو گئے تاکہ اہلِ خانہ بھی تیمارداری میں شریک ہو سکیں۔ اُن دنوں خوشاب میں ایک ریلوے ڈاکٹر کی قابلیت کا شہرہ تھا۔ مولانا محمد معصوم صاحب سے کہا گیا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو لے کر آئیں۔ پیغام کچھ ایسا تھا کہ میں بھی ساتھ چل پڑا۔ ڈاکٹر صاحب نے جب والدِ محترم سے حوصلہ افزا گفتگو کی تو میں نے یہ سمجھا کہ یہ مصیبت اللہ کے فضل و کرم سے بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے صبح ہی صبح جبکہ وہ بنگلہ میں مشرقی دیوار کے ساتھ بجانب جنوب بیٹھے تھے، پیٹ کے اندر ایک آلہ سا چبھویا۔ میری حیرانی کی انتہا کہ ان کے چہرے پر کوئی ناخوشگوار تاثر ظاہر نہ ہوا البتہ میرے لئے یہ مشاہدہ ناقابلِ برداشت حد تک اذیت ناک تھا۔ گھبراہٹ میں میں نے اللہ سے دُعا کی کہ "یا میرے پروردگار یہ مصیبت ان سے ٹل کر میری طرف منتقل ہو جائے لیکن: ع

ایں سعادت قسمتِ شاہباز و شاہین کردہ اند

جب اِس سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے اِس ترکیبِ علاج کو ترک کر دیا اور خوشاب جا کر کھانے والی ادویہ بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے اِس طرح ناکام لوٹنے سے حالات کے گھمبیر ہونے کا احساس اور زیادہ شدید ہو گیا۔ میٹرک کے امتحان میں اگرچہ چند ہفتے باقی تھے لیکن مجھے واپس جانے کی ہمت نہ ہوئی اور میں نے خوشاب جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں ان کے قرب و جوار ہی میں رہتا اِس لئے کہ

Marfat.com

دُور جانا میرے توہمات اور نادیدہ خدشات میں اضافہ کر دیتا۔ ایک دن بعد دوپہر جبکہ سورج بادلوں میں گم اور فضا بڑی مغموم تھی مجھے فرمایا کہ پیٹ پر زور کی مالش کرو۔ اُس وقت وہ چمڑے کے پلنگ پر شمالی دیوار کے قریب لیٹے ہوئے تھے۔ یہ خدمت کا ایک نادر موقع تھا۔ میں نے غالباً بادام روغن سے مالش شروع کر دی اور پورے زور سے مالش کرتا رہا تھوڑی دیر کے بعد تھکن کے باعث زور میں کمی آگئی۔ اُنہوں نے فرمایا "اور زور سے" میں پہلے ہی تقریباً نڈھال ہو چکا تھا۔ گھبرایا کہ اب کیا ہوگا۔ اسی گھبراہٹ میں میں نے از سرِ نو زور لگانا شروع کیا پھر مجھے دیر تک یہاں تک کہ مالش کے اختتام تک کسی تھکاوٹ کا احساس نہ ہوا اور نہ ہی قوت میں کوئی کمی واقع ہوئی۔

انہی دنوں علالت کی شدت میں مزید اضافہ کی خبر سُن کر نانا جان حضرت مفتی عطا محمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ جو عرس مبارک کی تقریب سے فارغ ہو کر واپس جا چکے تھے دوبارہ تشریف لائے۔ اب جو بزرگ حالات کی سُوجھ بُوجھ رکھتے تھے بالکل سنجیدہ اور متشوّش تھے اور اُن کے چہروں پر ہوائیاں اُڑتی ہوئی صاف نظر آ رہی تھیں۔ بار بار سر جوڑتے اور مختلف تجاویز کے متنوع پہلوؤں پر غور کرتے۔ سب کی تجویز یہ تھی کہ حضرت صاحب کو میو ہسپتال لاہور لے جایا جائے لیکن اس میں بقول حضرت مفتی صاحب صاحبِ فراش کی رضامندی شرطِ اوّل تھی۔ بالآخر والدہ ماجدہ رحمتہ اللہ علیہا کے اصرار پر اُنہوں نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔

میں صرف چند دن ہی بیشتر خوشاب لوٹ چکا تھا۔ خوشاب میں یہ خبر سُنی تو طبیعت ٹھیک نہ رہی۔ غیبی آوازوں کی سرسراہٹ سمجھنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ: ع

خَتم ہوتے دن اُس ڈالی کے جس پر تیرا بسیرا تھا

بعجلت تمام خوشاب لوٹ آنے کی حماقت پر بڑی ندامت ہوئی۔ دنیاوی دھندے اور زندگی کے کاروبار انسان کی وفا شعاری، پر اگر اثر انداز ہو جائیں تو اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو گا۔ امتحان کے لئے پڑھائی ناگزیر تھی لیکن : ؎

کس کام یہ دُنیا آئے گی جب عُمر رواں ہی بیت گئی

میں رات کو سو نہ سکا۔ گاڑی اُن دنوں صبح ۹ بجے خوشاب سے چل کر بوقت سحر للہ ریلوے اسٹیشن پہنچتی تھی۔ جب میں للہ ریلوے اسٹیشن پہنچا تو وہاں کی ہر چیز دگریۂ شبنم سے شرابور تھی۔ لاہور کے لئے معلوم نہیں میرا ساتھ کس نے دیا۔ بہر حال غالباً اُسی شام میں لاہور پہنچ گیا۔ معلوم ہوا کہ میو ہسپتال کے فیملی وارڈ کمرہ نمبر ۱ میں آپ کو رکھا گیا ہے۔ ساتھ ملحقہ کمرہ میں والدہ ماجدہ مع سجّادہ ٹوبھل مقیم تھے۔ دورانِ سفر میں نے کئی عجیب و غریب تصوّرات بھی قائم کر لئے تھے کہ جب میں کمرہ کے اندر جاؤں گا تو تمام تر شدّتِ مرض کے باوصف میری طرف دیکھ کر مسکرا دیں گے اور میں طمانیت قلب کی دولت سے مالا مال ان کے پاس بیٹھ جاؤں گا۔ میں شام سے تھوڑی دیر پہلے ہسپتال پہنچ گیا اور دھڑکتے دل سے دروازہ کھول کر اندر گیا تو وہ پلنگ پر دائیں طرف پانسہ پلٹ کر گہری نیند سو رہے تھے۔ سانس بالکل معمول کے مطابق چل رہی تھی معلوم ہوا کہ یہ نیند نہیں بے ہوشی ہے اور آپ گزشتہ روز سے اسی حالت میں لیٹے ہوئے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں کے ایک بینل نے اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کی ہے لیکن ان کے خیال میں مرض ایسے مرحلہ میں داخل ہو چکا ہے کہ اب اس پر کنٹرول کے امکانات بہت کم ہیں۔ میں یہ سب کچھ سُنتا رہا مگر کچھ بولنے کی ہمت نہ ہوئی میں ہسپتال کے در و دیوار پر لکھی ہوئی تحریر یہ :

"سر آمد روزگارے ایں فقیرے"

پڑھ رہا تھا۔ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی مکمل بے بسی اور بے چارگی کا احساس ہوا۔ میں علیحدگی میں سر پکڑ کر ایسے بیٹھ گیا گویا اب مزید زندہ رہنے کی خواہش باقی نہ رہی ہو۔

رات بسر کرنے کے لئے میں قاری عبیداللہ صاحب کے ہمراہ جناب ماموں عبدالقدوس صاحب ہاشمی کی رہائش گاہ ۳۲ منٹگمری پارک چلا گیا۔ جناب ممدوح نے نمک ہندوستان بھیجنے کا کاروبار نیا نیا شروع کیا تھا۔ علی الصبح پروگرام یہ سُنا کہ میں اور قاری عبیداللہ صاحب والدہ ماجدہ کے ہمراہ واپس لوٹ رہے ہیں۔ تیار ہو کر باہر آئے۔ ہم میو ہسپتال کے گیٹ جو نسبت روڈ کی طرف کھُلتا ہے، کے قریب پہنچے تو میں نے چچا جان سے درخواست کی ایک مرتبہ مجھے واپس جانے کی اجازت دیں۔ یہ اگرچہ بے وقوفانہ حرکت تھی۔ تاہم چچا جان نے کوئی تعرض نہ فرمایا۔ میں دوڑ کر واپس آیا اور زندگی میں آخری بار اُن کو دیکھنے کی غرض سے دروازہ کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور وہیں کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑے ہی خوبصورت انسان تھے اور بڑے ہی ذی وقار۔ ایسی تکلیف دہ اور ہیجان لیوا طویل مرض کی پوری شدت میں کسی انسان نے ان کے چہرے کی ہیئت کو بدلتے نہ دیکھا، ناگواری کی رمق تک اُن کے چہرے سے عیاں نہ ہوئی نہ کسی نے "ہائے" سُنی اور نہ ہی کوئی حرفِ شکایت۔ وہ اپنے تمام تر حُسن و جمال اور وقار و تمکنت کے ساتھ مکمل سکون سے لیٹے گہرے سانس لے رہے تھے۔ کاش زندگی اتنی مستعار نہ ہوتی۔ آج یعنی ۱۲ فروری کو ان کا یوم پیدائش بھی تھا اور آج ہی ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کو وہ اپنی زندگی کے تینتالیس سال پورے کر رہے تھے۔

سحرے گفت بُلبُل باغباں را
دریں گل جز نہالِ غم نگیرد

Marfat.com

بہ پیری مے رسد خار بیاباں
ولے گل چوں جواں گردد بمیرد

"ایک صبح بلبل باغباں سے یہ شکوہ کر رہی تھی کہ دُنیا کے اندر پھول کی قسمت میں صرف غم اُٹھانا ہی لکھا ہے۔ (یہ کیا بات ہوئی کہ) جنگل میں اُگنے والا کانٹا تو بڑھاپے کی منزلیں طے کرے اور پھول کھلنے کے ساتھ ہی مُرجھا جائے"

اُس دن کا سفر بہت بے کیف تھا۔ لالہ موسیٰ پلیٹ فارم پر میں اِدھر اُدھر بے مقصد چکر لگا کر ملکوال کے لئے گاڑی روانہ ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ یہ سفر طویل تر محسوس ہوا۔ للّٰہ گاؤں کے بالمقابل گاڑی رُک گئی۔ یہ ڈرائیور کی مہربانی تھی۔ عورتوں کے ہجوم میں بے ہنگم آہ وبکا سے طبیعت بہت خراب ہوگئی۔ قاری صاحب اور محمد صبغتہ اللہ صاحب بھی ہمراہ تھے۔ دوسرا دن خاموشی سے گزر گیا۔ تیسرے یعنی ۱۲ فروری کو تو ہم نے اِس امکان پر بھی غور کیا کہ شائد کسی معالج کی کوئی تدبیر کارگر ثابت ہوگئی ہو۔ اسی گو مگو میں شام ہوگئی۔ ہم سب سہمے ہوئے اُوپر بنگلہ میں یکجا تھے۔ حاجی میاں محمد مرزا صاحب اور جناب میاں محمد حسن صاحب مغفور والد ماجد جناب محمد زاہد چشتی بھی ہمارے پاس موجود تھے۔ کسی نے صدا دی کہ "تار آیا ہے" اچانک سب دم بخود ہو گئے۔ کسی میں بھی حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ صاحبزادہ عبدالرسول صاحب نے اُٹھ کر تار لیمپ کے قریب کر کے کھولا

خناہ را بادۂ ہر جام کردند
چہ بے دردانہ او را عام کردند

Marfat.com

تماشہ گاہِ "ختم آشیاں" را

جہانِ ماہ و انجم نام کردند

حاجی میاں مرزا صاحب تھوڑی دیر تو خاموش رہے پھر اچانک مشرقی دروازہ سے نکل کر دوڑ پڑے اور ایک دلدوز چیخ کے ساتھ سیڑھیاں اُتر گئے۔ اطلاع کے مطابق علیٰ الصبح خوشاب کے راستہ آپ کو لایا جا رہا تھا۔ پلیٹ فارم مکمل چاند کی اُداس روشنی کے اندر سکوتِ حیرت میں غرق تھا۔ گاڑی ریلوے اسٹیشن کی حدود میں داخل ہوئی تو صبر و تحمّل نام کی کوئی چیز باقی نہ رہی۔ چوبی صندوق میں آپ کو رکھا گیا تھا۔ گھر پہنچے تو شیش محل کے سامنے صحن میں آپ کو رکھ دیا گیا۔ باپردہ خواتین زیارت کر چکیں تو عام مستورات کے لئے جگہ بہت تنگ ہو گئی۔ صندوق باہر بنگلہ میں منتقل کر دیا گیا لیکن عجیب بات یہ کہ یہ وسیع اور فراخ میدان بھی جیسے سُکڑ گیا ہو۔ آپ کے وجود مبارک پر پھولوں کا ایک خوبصورت ہار رکھا تھا جو حرکتِ قلب اور اُس کی تھرتھراہٹ سے ایک طرف گر جاتا دراصل اِسی "حرکتِ قلب" کا تسلسل ہی میو ہسپتال کے ڈاکٹروں بالخصوص ڈاکٹر ریاض قدیر کے لئے عجیب و غریب پریشانی کا باعث بن چکا تھا۔ حقیقت میں موت ایک دن پہلے ہی واقع ہو چکی تھی لیکن ڈاکٹروں کی جماعت تمام نشانیاں موجود پا کر بھی اِسے موت قرار دینے سے متردد تھی۔ معالجین کے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا کہ انسان پر مکمل موت بھی طاری ہو چکی ہو لیکن اُس کا دل معمول کے مطابق حرکت بھی کر رہا ہو۔ میں اِس بے ہنگم بھیڑ کو چیرتا صندوق کے سرہانے جا کر کھڑا ہو گیا۔ دل کے مخصوص مقام پر دل کی دھڑکن جیسی حرکت مسلسل ہو رہی تھی اور سینے پر سے پھول بار بار آہستہ آہستہ سرکتے سرکتے نیچے گر جاتے۔ ماتھے پر ابرق سفید سے ملتی جلتی چمکدار لکیریں تھیں۔ عام نظر میں بالکل پسینہ سے مشابہ لیکن ہاتھ لگانے سے

Marfat.com

ان پر کوئی فرق نہ پڑتا۔

یہ دو شواہد ایسے ہیں کہ ہزارہا انسانوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اگر میں خود ان کا مشاہدہ نہ کرتا تو انہیں تسلیم کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی۔

لوگوں کے کثیر اجتماع کے پیشِ نظر طے یہ پایا کہ روائتی جنازہ گاہ جو مسجد خانقاہ شریف سے شمال مغرب میں قبرستان سے ملحقہ تھی بالکل ناکافی ہوگی۔ لہٰذا جنازہ ہماری زرعی زمین سے متصل ایک وسیع و عریض میدان الموسوم "رمضان والے پڑ" میں ادا کی جائے۔ چنانچہ بعد دوپہر صندوق جب اُٹھایا گیا تو مزید کہرام مچا اور بڑی دردناک چیخیں بلند ہوئیں۔ بنگلہ سے "رمضان والے پڑ" تک مخلوقِ خدا بکھری پڑی تھی۔ لمبی لمبی تیرہ کے قریب قطاریں ترتیب دی گئیں اور ایک اندازہ کے مطابق فی صف کم سے کم پانچ، چھ سو نفوس تھے۔

حضرت عم محترم کی فرمائش پر نمازِ جنازہ حضرت صاحبزادہ محمد عمر صاحب نقشبندی مجددی سجادہ نشین بیربل شریف (سرگودھا) کی اقتداء میں ادا ہوئی۔ نماز جنازہ سے فراغت کے بعد جناب مولوی سیف الدین از سالم نے حاضرین سے مخاطب ہو کر یہ تجویز پیش کی کہ حضرت صاحب کے بڑے صاحبزادے۔ صاحبزادہ محمد مطلوب الرسول صاحب کی دستار بندی اسی موقع پر کرا دی جائے۔ الحاج چوہدری احمد خان صاحب للّٰہ شریف اور حضرت مفتی صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے تائید فرمائی بلکہ تمام حاضرین نے اس تجویز کو مستحسن قرار دیا۔ جناب عمّ محترم، جناب مفتی صاحب اور جناب صاحبزادہ محمد عمر صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اس کی ابتداء کی اور باقی بزرگان نے تبرکاً اس میں شمولیت کی۔

Marfat.com

اعلیٰ حضرت قدّس سرّہٗ العزیز کی بائیں جانب لحد تیار ہو چکی تھی۔ واپس مسجد خانقاہ شریف پہنچے تو صحنِ مسجد میں فقیر کرم دین پر عجیب و غریب عالم طاری تھا۔ اُس نے تدفین میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔ دُنیا و مافیہا سے بے نیاز ننگے سر کو بکھرے ہوئے لمبے بالوں کے ساتھ اُوپر اُٹھاتا اور آسمان کی طرف دیکھ کر پھر گھٹنوں تک نیچے لے جاتا اس عملِ مسلسل میں وہ گرد و پیش سے بالکل لاتعلّق تھا۔ آنکھیں سُرخ اور متورّم اور سُبحان اللہ سُبحان اللہ کی گردان میں بھیگے نون، ان سے جاری و ساری۔

غلام جیلانی مستری اُن حضرات میں شامل تھا جنہوں نے صندوق کو لحد میں رکھا اُس نے اُن کے چہرے سے لمحہ بھر کے لئے بھی نظر نہیں ہٹائی۔ خانقاہ شریف کے اندر یہ واحد آدمی تھا جس کے جذبات اُس کے قابو سے باہر تھے۔ وہ رو رو کر ہلکان ہو رہا تھا اور لوگوں سے کہتا:

"دیکھو میرے پیر کو دفن کر رہے ہیں۔ اَب زندگی بھر ان کو نہیں دیکھ سکوں گا۔"

ایک دُنیا ڈوبتے سورج کو وقتِ شام دیکھ رہی تھی۔ تدفین کے مراحل لمحہ بہ لمحہ اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چند ہی لمحوں میں جلال و جمال کا ایک پیکرِ حسین مٹّی کی ایک خاموش ڈھیری کی شکل اختیار کر گیا اور کمال یہ کہ اِسکے ساتھ ہی بڑی بڑی اُمیدیں، خوبصورت آرزوئیں اور حسین تمنّائیں بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئیں۔

اُڑتے اُڑتے آس کا پنچھی دُور اُفق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

عمر رفتہ

104

صاحبزادہ
مقصود الرسول